امامیہ مشن لکھنؤ کا چھپنواں تبلیغی رسالہ

(رجسٹرڈ)

ابوالائمہ کی تعلیمات

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

قیمت ۶/

محصول ڈاک

قومی عظمت کے نشانات

- زندگی کا متعین مقصد
- افراد کا پاکیزہ کردار
- حصولِ مقصد کے لئے مؤثر تڑپ
- پاکیزہ و صالح لٹریچر
- اجتماعی زندگی میں تنظیم

اس مقصد کی وضاحت کیلئے

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ

اردو بازار لاہور

کے مطبوعات کا مطالعہ فرمائیں

آپ مذہب کی حمایت کیونکر کرسکتے ہیں ؟

(۱) امامیہ مشن کی ممبری قبول فرماکر۔
(۲) امامیہ مشن کے استقلال فنڈ کے ٹکٹ خرید فرماکر۔
(۳) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل خرید کر۔

جس سے آپ کی مذہبی معلومات میں اضافہ ہوگا اور مشن کی امداد بھی ہوجائیگی۔

(۴) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل ہم سے رعایتی قیمت پر خرید فرماکر غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرکے (جیساکہ بعض ہمدردانِ ملت عامل ہیں)

امامیہ مشن ۵۶ تبلیغی رسائل چھ سال کے اندر اندر شائع کرچکا ہے جس کی کل تعداد ۱۰۸ ہزار سے اوپر ہوچکی ہے۔

ہر سال عشرۂ ماہ محرم میں اردو، ہندی، انگریزی رسائل غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرتا ہے۔ لکھنؤ کی اچھوت کانفرنس میں دو زبانوں میں مفت رسائل تقسیم کیے ہیں۔

(خادم مذہب)

آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

ابوالائمّہ کی تعلیمات

مصنّفہٗ

حضرت فخر المحققین سید العلماء مولانا
السیّد علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلہ

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

امامیہ مشن لکھنؤ کی چھپنویں دینی خدمت

گذشتہ زمانہ میں بعض حلقوں کے اندر اس قسم کی کوشش بھی جاری رہی ہے کہ فرقۂ شیعہ کے عقائد کی رد میں نہج البلاغہ کی عبارتوں سے مدد حاصل کیجائے۔ یہ کوشش حقیقت کے لحاظ سے کتنی ہی دور از کار ہو لیکن بعض ناواقف افراد کیلئے غلط فہمی کا باعث ضرور ہو سکتی ہے

جناب سید العلماء دام ظلہ نے اس رسالہ میں ثابت کیا ہے کہ نہج البلاغہ کے تعلیمات سراسر مذہب شیعہ کے مؤید ہیں۔

اس کے علاوہ اُن عبارتوں کے صحیح مطالب کی تحقیق کی ہے جن سے غلط فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں بعض علمی و مذہبی مسائل کی فیصلہ کن تحقیق بھی کی گئی ہے۔

امید ہے کہ مشن کی اس خدمت پر بھی افراد قوم توجہ سے کام لیں گے اور ہماری ہمت افزائی فرمائینگے۔

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی سکریٹری امامیہ مشن

وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین و الصلوۃ علی سید المرسلین و آلہ الطاہرین

اس کے قبل "نہج البلاغہ کا استناد" دنیائے تحقیق میں پیش کیا جا چکا ہے جس میں علمائے اسلام اور مستند ارباب قلم کے بیانات سے کتاب "نہج البلاغہ" کا اعتبار اور اُس کے مندرجات کا کلام امیر المومنینؑ ہونا ثابت ہو چکا اور معلوم ہوا کہ انصاف پسند اور محقق علمائے اہل سنت نے نہج البلاغہ کو امیر المومنینؑ کا کلام تسلیم کیا ہے۔ رسالتمآب کی مشہور و متواتر حدیث علی مع الحق والحق مع علی کی بنا پر مسلمانوں کیلئے اب یہ کھلا ہوا راستہ تھا کہ وہ حقانیت کے راستے میں اس کتاب کو اپنا پیشوا بناتے اور جس قسم کے تعلیمات اس کتاب سے مستفاد ہوتے اُن کو اپنے سر اور آنکھوں پر رکھ کر اُن کو اپنا سرمایۂ ایمان و اعتقاد قرار دیتے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا مسلمانوں نے زیادہ تر اس خزانۂ تحقیقات و معارف سے چشم پوشی کرنا ہی اپنے لئے بہتر سمجھا۔ خدا نیک بدلا دے شیخ محمد عبدہ مفتی دیار مصریہ کو جنھوں نے اپنی بلند نظری اور حقیقت پسندی سے اس کتاب کو اپنے مخصوص حواشی کے ساتھ مصر میں شائع کر دیا جس کے بعد موصوف کی شخصیت اور مسلم مرجعیت اور قابلیت کی بنا پر عام اشخاص کو

بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لینا پڑی اور اس طرح کئی مرتبہ اُس کے چھپنے کی مصر و بیروت میں نوبت آئی نہیں تو جامعۂ اسلامی کا بڑا طبقہ اس کتاب کی صورت سے بھی واقف نہ ہوتا۔

بیشک شیعی طبقہ جس نے شروع ہی سے ائمہ اہلبیتؑ کے اقوال و ہدایات کی پیروی اختیار کی تھی اُس نے امیرالمومنینؑ کے ان گرانقدر افادات سے بیش قرار فائدہ اُٹھایا۔ اور وہ انھیں پورے طور سے مرکز توجہ قرار دئے رہے۔

نہج البلاغہ کے تعلیمات اتنے وسیع جامع اور محیط ہیں جو عالم معنویات کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں اور اس لئے شروع سے لیکر آخر تک تمام مذہبی تعلیمات اور اہم اصول و عقائد کے لئے وہ معیار بننے کے قابل ہیں۔

چنانچہ اس موقع پر ہم نہج البلاغہ کے مندرجہ مضامین کو جو مختلف مسائل مذہب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں ایک مرتب نظام کے ساتھ درج کرتے ہیں جس سے ثابت ہوگا کہ مذہب شیعہ کے اصول کس درجہ امیرالمومنینؑ کے حقائق آموز تعلیمات کے مطابق ہیں

توحید

(۱)

خدا کے لئے ذات سے جداگانہ صفات کی نفی

نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص۱۲

اول الدّین معرفتہ وکمال معرفتہ التصدیق بہ وکمال التصدیق بہ توحیدہ، وکمال توحیدہ الاخلاص لہ وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ لشہادۃ کلّ صفۃ انّہا غیر الموصوف وشہادۃ کلّ موصوف انّہ غیر الصفۃ فمن وصف اللہ سبحانہ فقد قرنہ ومن قرنہ فقد ثناہ.

"دین کی پہلی منزل خدا کی معرفت ہے اور معرفت کا اہم جزو تصدیق ہے اُس کی اور تصدیق کا اہم جزو توحید ہے اُس کی اور توحید کا اہم جزو اخلاص ہے اُس کے لئے اور اخلاص کا اہم جزو یہ ہے کہ اُس کے لئے ذات سے ماسوا صفات کا انکار کرے اس لئے کہ صفت کا مفہوم بوتا ہے کہ وہ موصوف کا غیر ہے اور موصوف کا مفہوم کہتا ہے کہ وہ صفت کے علاوہ ہے تو جس نے خدا کے لئے صفت ثابت کی اُس نے خدا کا ہمسر بنا دیا اور جس نے خدا کا ہمسر بنایا اُس نے اُس کو دو سمجھ لیا (ایک ذات اور ایک صفت لہذا توحید ہاتھ سے گئی"

ص۲۹۴ من وصفہ فقد حدّہ ومن حدّہ فقد عدّہ ومن عدّہ فقد ابطل ازلہ

"جس نے خدا کے لئے صفت ثابت کی اُس نے اُسے محدود بنا دیا

(کیونکہ ذات الٰہی کو خود اُس نے کمالات سے عاری مانا اور اُس کو محتاج
اپنے کمالات میں اوصاف کا قرار دیا) اور جس نے اُس کو محدود بنا دیا
وہ اُس کو دوسری تمام اشیاء کی قطار میں لے آیا اور جو اُس کو دوسرے اشیاء
کے شمار میں لے آیا اُس نے اُس کے ازلی اور قدیم ہونے کو غلط ٹھہرا دیا
(کیونکہ وہ محتاج ہے اور جو محتاج ہے وہ حادث ہے قدیم نہیں)

(۲)

خدا کا کوئی مکان اور محل نہیں

ص۱۰۱ من قال فیم فقد ضمنہ ومن قال علیم فقد اخلی منہ

"جو شخص کہے کہ وہ کاہے میں ہے؟ تو اُس نے خدا کو کسی شے کے ضمن میں
فرض کر لیا (اور یہ صحیح نہیں اس لئے کہ خدا محدود نہیں ہے) اور جو شخص
کہے کہ وہ کاہے کے اوپر ہے؟ تو اُس نے اُس سے خالی حدود بھی
فرض کر لئے (حالانکہ وہ کسی جگہ سے خصوصیت نہیں رکھتا۔ ہر جگہ ہے اور
کہیں نہیں ہے)"

ص۳۵۳ لا یشغلہ شان ولا یغیرہ زمان ولا یحویہ مکان.

"اُس کو کوئی حالت متفرق نہیں کر سکتی اور نہ امتداد زمانہ اُس
میں تغیر پیدا کر سکتا ہے اور نہ کوئی مکان اُس کو شامل ہو سکتا ہے۔"

(۳)

نفی رویت

یعنی

خدا دیکھنے کی چیز نہیں ہے

ص۱۷۵ الاول الذی لم یکن لہ قبل فیکون شیئ قبلہ والآخر
الذی لیس لہ بعد فیکون شیئ بعدہ والرادع اناسی الابصار
عن ان تنالہ او تدرکہ.

"اول ہے ایسا جس کی کوئی ابتدا نہیں تاکہ کوئی شے اُس کے قبل
فرض کی جا سکے اور آخر ہے ایسا کہ اُس کے لئے انتہا نہیں تاکہ کوئی شے
اُس کے بعد خیال کی جا سکے۔ وہ جو روکنے والا ہے مردمک چشم کو اس
بات سے کہ وہ اُسے پا سکیں یا اُس تک پہونچ سکیں۔

ص۳۰۹ انک حی قیوم لا تاخذک سنۃ ولا نوم لم ینتہ الیک
نظر ولم یدرکک بصر ادرکت الابصار واحصیت الاعمار۔

"خداوندا تو زندہ۔ قائم و دائم ہے۔ نہ تیرے لئے غنودگی ہے نہ نیند۔
تجھ تک کوئی نظر پہونچ نہ سکی۔ اور تجھ کو کوئی بصارت پا نہیں سکی۔
بیشک تو نے تمام نظروں کا احاطہ کیا اور تمام لوگوں کی عمر کا جائزہ
لیا ہے۔"

ص۳۵۵ لا تدرکہ العیون بمشاھدۃ العیان ولکن تدرکہ القلوب بحقائق الایمان۔

"اُس کو ظاہری آنکھیں اپنے مشاہدے دیکھ نہیں سکتیں لیکن دل ہیں جو اُس کو ادراک کرتے ہیں حقیقت ایمان کے ذریعہ سے۔"

ص۳۶۷ الحمد للہ المعروف من غیر رؤیۃ الخالق من غیر منصبۃ

"ستائش اُس خدا کے لئے جو بغیر دیکھے پہچانا جاتا ہے۔ اور بغیر کسی تھکن، مشقت کے خلق کرنیوالا ہے۔"

ص۳۷۲ الحمد للہ الذی لا تدرکہ الشواھد ولا تحویہ المشاھد ولا تریہ النواظر ولا تحجبہ السواتر۔

"ستائش اُس خدا کے لئے جس کو مشاہدات پا نہیں سکتے اور جسمانی مناظر جس کو سما نہیں سکتے اور آنکھیں جسکو دیکھ نہیں سکتیں اور پردے جس کو مخفی نہیں کر سکتے۔"

(۴)

خدا کو جزئیات کا علم

مسلمانوں کے بہت سے افراد نے باتباع بعض فلاسفہ یہ سمجھ لیا کہ خداوند عالم کو کلیات کا علم تو ہوتا ہے۔ مگر جزئیات اُسکے دائرہ علم سے خارج ہیں۔ جزئیات کے ساتھ علم آلٰہی کے متعلق ہونے میں اُن کو بڑی دشواریاں نظر آئیں جنکا واحد حل اُن کو یہی نظر آیا کہ خدا کے علم کو محدود بنا دیں۔ حالانکہ عقل خدا کی ذات کے کامل

ہونے کا فیصلہ کر کے جزئیات سے اُس کے علم کے متعلق نہ ہونے کو بہت بڑا نقص سمجھتی ہے جو کسی طرح خدا کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

اُن کی مزعومہ دشواریاں غور کرنے کے بعد سراب سے زیادہ اصلیت نہیں رکھتیں۔ جزئیات کو متغیر دیکھ کر اُنھیں خداوند عالم کے قدم ذاتی کو خطرہ نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ معلومات کے تغیر یا حدوث سے علم اور عالم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تجدد و حدوث معلوم میں ہے علم میں نہیں ہے۔

اہل حق کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا علم محیط ہے۔ کوئی شے اُس کے علم سے خارج نہیں ہے۔ جزئیات ہوں یا کلیات سب یکساں طور پر اُسکے دائرہ علم میں داخل ہیں۔

نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے اور خدا کے احاطہ علمی کی مکمل طور سے الفاظ کے اعجاز میں تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ص۱۴۲ احاطکم بالاحصاء وارصد لکم الجزاء واثرکم بالنعم السوابغ والرفد الروافغ وانذرکم بالحجج البوالغ واحصاکم عددا ووظف لکم مددا

خدا نے تمھارا پورا جائزہ لیکر تم کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور تمھارے

جزا اخروی کے مواقع فراہم کئے ہیں اور تمھیں کامل نعمتوں اور مکمل
انعامات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور تم کو کامیاب دلائل کے ساتھ
اپنا خوف دلایا ہے اور تمھاری مردم شماری پوری پوری کر کے تمھارے
لئے وظیفے مقرر کئے ہیں"۔

ص۱۷۳ قسم ارزاقهم واحصىٰ آثارهم واعمالهم وعدد
انفاسهم وخائنة اعينهم وما تخفى صدورهم من الضمير و
مستقرهم ومستودعهم من الارحام والظهور الى ان تتناهى
بهم الغايات.

"اُس نے تمام لوگوں کے رزق تقسیم کئے اور اُن کے باقیماندہ نشانوں
اور کارگذاریوں اور اُن کی سانسوں کی تعداد اور آنکھوں کی چشمکوں
اور دل کے چھپے ہوئے خیالات اور جہاں اُن کے نطفوں کی قرارگاہیں
اور امانت رکھے جانے کی جگہیں تھیں ماؤں کے شکم اور آبا ؤ اجداد کی
پشت میں یہاں تک کہ اُنھیں خلقت کے حدود اپنی انتہا تک پہونچائیں
ان تمام باتوں کا وہ پورا پورا جائزہ لئے ہوئے ہے"۔

ص۱۹۴ عالم السر من ضمائر المضمرين ونجوى المتخافتين وخواطر
رجم الظنون وعقد عزيمات اليقين ومسارق ايماض
الجفون وما ضمنته اكنان القلوب وغيابات الغيوب وما

اصغت لاستراقه مصائخ الاسماع ومصائف الذر ومشاتى
الهوام ورجع الحنين من المولهات وهمس الاقدام ومنفسح الثمرة من
ولائج غلف الاكمام ومنقمع الوحوش من غيران الجبال واوديتها ومختبأ
البعوض بين سوق الاشجار والحيتها ومغرز الاوراق من الافنان ومحط
الامشاج من مسارب الاصلاب وناشئة الغيوم ومتلاحمها ودرور قطر السحاب
فى متراكمها وما تسفى الاعصار بذيولها وتعفو الامطار بسيولها
وعوم نبات الارض فى كثبان الرمال ومستقر ذوات الاجنحة
بذرى شناخيب الجبال وتغريد ذوات المنطق فى دياجير
الاوكار وما اوعبته الاصداف وحضنت عليه امواج البحار
وما غشيته سدفة ليل او ذر عليه شارق نهار وما اعتقبت
عليه اطباق الدياجير وسبحات النور واثر كل خطوة وحس
كل حركة ورجع كل كلمة وتحريك كل شفة ومستقر كل نسمة
ومثقال كل ذرة وهماهم كل نفس هامة وما عليها من ثمر
شجرة او ساقط ورقة او قرارة نطفة او نقاعة دم ومضغة
او ناشئة خلق وسلالة لم يلحقه فى ذلك كلفة ولا اعترضته
فى حفظ ما ابتدعه من خلقه عارضة ولا اعتورته فى تنفيذ
الامور وتدابير المخلوقين ملالة ولا فترة بل نفذ فيهم علمه

واحصاهم عدہ ووسعهم عدلہ وغمرهم فضلہ مع تقصیرهم عن کنہ ما هو اهلہ۔

"وہ ہر پوشیدہ بات کا جاننے والا ہے جیسے تصوّر کرنیوالوں کے قلبی تصوّرات، سرگوشی کرنیوالوں کی رازداریاں، توہمات وخیالات کی گردشیں، مضبوط یقینی عقیدوں کی بندشیں، دزدیدہ نگاہوں کی جنبشیں، دل کے پردوں کے بھید، اور غیب کی گہرائیوں کی باتیں، پردے پیچھے کان لگا کر سنی جانے والی گفتگوئیں، چونٹیوں کی گرمی کے زمانہ کی قیامگاہ اور چوپایوں کی جاڑوں میں رہنے کی جگہیں، غمزدہ عورتوں کی تھراتی ہوئی آوازِ گریہ کی لرزش، پیروں کے چاپ کی ہلکی آوازیں، کلیوں کے غلاف میں اندرونی حصہ کے اندر میوہ کے پھیلنے کی گنجائش، پہاڑوں کے غاروں اور وادیوں میں وحشی جانوروں کے گوشہ گیر ہونے کی جگہیں، درختوں کی جڑوں اور چھالوں میں مچھر ایسے کمزور مخلوقوں کے چھپنے کے مقام، شاخوں میں پتیوں کے نکلنے کی راہیں، مردوں کی پشت کے پیچیدہ راستوں میں انسانی نطفوں کی روشیں، پیدا ہونے والے ابر اور اُن کی تہہ بہ تہہ ترکیبیں، ابر کی تہوں میں قطرات باراں کی روانی، بگولوں کے دامن میں لپٹ جانے والے ذرّے، بارشوں کے سیلاب کے

مٹ جانے والے نقشے، ریگ کے تودوں میں روئیدہ گھاس کی ریشہ دوانی، پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں کے اوپر پرند جانوروں کے آشیانے، گھونسلوں کی تاریک فضاؤں میں بولنے والے طائروں کے چہچہے، وہ کہ جسے سیپت رکھیں سیپیاں اور جس کی پرورش کریں سمندر کی موجیں - وہ کہ جس پر پردہ ڈالے رات کا اندھیرا یا روشنی ڈالے دن کا آفتاب - وہ کہ جس پر یکے بعد دیگرے آئیں اندھیرے کے سرپوش اور روشنی کے تڑکے، ہر قدم کا نشان، ہر چیز کے ہلنے کی سنسناہٹ، ہر کلمہ میں آواز کا اُتار چڑھاؤ، ہر ہونٹ کی جنبش، ہر متنفس کی جگہ، ہر ذرہ کا وزن، ہر متفکر انسان کی اندرونی کشمکش، جو کچھ زمین کے اوپر ہے درختوں سے گرا ہوا میوہ یا ٹوٹا ہوا پتّہ یا قرار یافتہ نطفہ یا ٹھہرا ہوا خون اور گوشت کا ٹکڑا یا پیدا شدہ خلقت اور انسانی نسل اس سب کا خدا کو علم ہے جس میں اُس کو نہ کچھ زحمت اُٹھانا پڑی ہے اور نہ اپنے خاص ایجاد کردہ مخلوق کے ان حالات کے محفوظ کرنے میں اُسے تھکن اور کمزوری پیدا ہوتی ہے بلکہ پورے طور سے ان کے اندر پہونچا ہوا ہے اُس کا علم اور اُن کا پورا پورا جائزہ لئے ہوئے ہے اُس کی عدالت اور اُن پر چھایا ہوا ہے اُس کا احسان حالانکہ وہ اُس حق کے ادا کرنے سے جو اُس کے شایان شان ہے

قاصر ہیں:

کیا عام افراد کے ذہن نشین ہونے کے قابل علم الٰہی کے عظیم احاطہ و وسعت کی تصویر اس سے زیادہ نمایاں خط و خال میں کھینچی جا سکتی ہے۔

ص۲۲۷ ۔ من تکلم سمع نطقہ، ومن سکت علم سرہ

"جو کوئی کچھ کہتا ہے وہ اس کی آواز سنتا اور جو خاموش رہتا ہے اُس کے دل کی بات جانتا ہے۔"

ص۴۳۳ یعلم عجیج الوحوش فی الفلوات ومعاصی العباد فی الخلوات واختلاف النینان فی البحار الغامرات وتلاطم الماء بالریاح العاصفات.

"وہ جانتا ہے وحشی جانوروں کی صداؤں کو جو جنگلوں میں بلند ہوتی ہیں اور اپنے بندوں کے گناہوں کو جو تنہائی کی جگہوں پر ہوتے ہیں اور مچھلیوں کی آمد و رفت کو جو سمندروں کی تہہ میں ہوتی ہے اور پانی کے تھپیڑوں کو جو تیز ہواؤں کے جھکڑوں سے ہوتے ہیں"

(۵)
خدا کی عدالت

فرقۂ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم کے تمام اوامر و احکام اور افعال و تقدیرات میں صفت عدل کارفرما ہے اُس کا کوئی فعل کبھی عدل کے خلاف نہیں ہوتا اور ناممکن ہے کہ اُس کے کسی فعل کی طرف ظلم کی نسبت صحیح ہو۔

دنیا کی کائنات میں جو اختلاف نظر آتا ہے اور افراد بشر میں باعتبار استغناء و ثروت اور فقر و احتیاج جو دو رنگی نمایاں ہے سب صفت عدالت کے ساتھ ہے اور کسی میں عدالت کے خلاف ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہے۔

دوسرے لوگ خدا کی صفت عدل کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دنیا میں بلاؤ مصیبت، کشائش و راحت۔ تنگدستی و احتیاج۔ تونگری و استغناء کسی اصول عدالت اور معیار حکمت پر مبنی نہیں ہے۔ اور صرف خدا کی قدرت و سلطنت اور قہر و غلبہ کا مظہر ہے۔

امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں صاف طور سے قدرت کی کارفرمائیوں کو عدل و حکمت پر مبنی بتلایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ص۱۹۳ قدر الارزاق فکثرها وقللها وقسمها علی الضیق والسعة فعدل فیها لیبتلی من اراد بمیسورها ومعسورها ولیختبر بذلک الشکر والصبر من غنیها وفقیرها۔

"اُس نے رزق معین کئے تو اُن کو زیادہ بھی رکھا اور کم بھی اور اُن کو تقسیم کیا تنگی اور وسعت کے اختلاف کے ساتھ تو اس میں عدالت کو ملحوظ رکھا جس سے مطلب یہ تھا کہ آزمائش ہو جس کی وہ چاہتا ہے آسانی

دکشائش اور سختی و تکلیف کے ذریعہ سے اور امتحان ہو اس سے شکر اور صبر کا غنی اور فقیر کے۔

صـ۳۷۲ الّذی صدق فی میعادہ وارتفع عن ظلم عبادہ وقام بالقسط فی خلقہ وعدل علیھم فی حکمہ۔

"وہ کہ جو سچا ہے اپنے وعدہ میں اور بلند ہے اس بات سے کہ ظلم کرے اپنے بندوں پر اور قائم و برقرار ہے انصاف کے ساتھ اپنی کائنات میں اور عدالت سے کام لیتا ہے اُن پر اپنے حکم میں"۔

"ارتفع" کی لفظ میں جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ ظلم درحقیقت نقص ہونے کی بنا پر ذات الٰہی کے لئے ناممکن ہے۔ ثبوت عدالت کے برہان عقلی پر ایک عمیق تبصرہ کیا ہے۔

(۶)

نفی جبر

انسانوں کے افعال میں انسانوں کی قدرت کو کہاں تک دخل ہے؟

یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں عقول نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں کچھ لوگوں نے تو انسان کو اپنے افعال میں بالکل مستقل جان کر خدا سے اُن کے سلسلہ کو قطع ہی کر لیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اُن افعال کی

پوری ذمہ داری خدا پر قرار دیدی ہے اور اُن کا خیال ہے کہ انسان کو اس میں کچھ قدرت و اختیار ہی نہیں ہے۔

فرقۂ امامیہ کا مسلک اس بین بین ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کا کام اُس کی قدرت و اختیار کا نتیجہ ہے لیکن وہ آلات و اسباب جنکے ذریعہ سے انسان کو عمل پر قدرت حاصل ہوتی ہے خدا کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے جب خدا چاہے ان اسباب و ذرائع کو سلب کر کے انسان کو عاجز و مجبور بنا دے۔

یہی وہ تعلیم ہے جو امیر المومنینؑ کے کلام سے مستفاد ہوتی ہے ملاحظہ ہو صـ۲۴۰ ج ۲

کلمہ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کے معنی دریافت ہوئے حضرت نے فرمایا۔

انا لا نملک مع اللہ شیئا ولا نملک الا ما ملکنا فمتی ملکنا ما ھو املک بہ منا کلفنا ومتی اخذہ منا وضع تکلیفہ عنا۔

"ہمیں خدا کے مقابلہ میں ذرا سا بھی اختیار نہیں ہے ہمیں جس قدر بھی قدرت اور اختیار ہے وہ وہی ہے جو خدا نے ہمیں عطا کر دیا ہے اس لحاظ سے جب وہ ہمیں قدرت عطا کرتا ہے اُن افعال پر کہ جن پر اُس کا اقتدار ہم سے زیادہ ہے تو وہ ہم کو مکلف بناتا ہے۔ یعنی

وامر و نواہی ہم متعلق کرتا ہے اور جب وہ قدرت کو ہم سے سلب کرلیتا ہے تو تکالیف کو ہم سے ہٹالیتا ہے"۔

اس سے ایک طرف یہ ثابت ہوا کہ انسان کے افعال قدرت واختیار کا نتیجہ ہیں۔ دوسری طرف یہ ظاہر ہوا کہ پھر بھی انسان خدا کے مقابلہ میں مطلق العنان نہیں ہے۔ بلکہ جب خدا چاہے تو انسان کے قدرت و اختیار کو سلب کرلے تیسری طرف اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ خدا تکلیف مالا یطاق نہیں کرتا جو عدل کے خلاف ہے۔ چوتھی طرف یہ معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہوتا تو تکالیف شرعیہ مہمل و باطل ہو جاتے جو حقیقت میں نفی جبر کا برہان قوی ہے

نبوّت

(۷)

طہارت اصلاب و ارحام انبیاء

فرقۂ شیعہ کا اعتقاد ہے کہ انبیاء کا سلسلۂ نسب پدری و مادری دونوں حیثیتوں سے پاک پاکیزہ شرک و کفر کی نجاست سے مقدس و منزہ ہوتا ہے۔ اُنکے ددھیالی ننھیالی سلسلۂ اجداد میں کہیں بھی ایمان کی جگہ کفر کا نشان نہیں

ہو سکتا۔ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں نے نہ معلوم کن مقاصد کے تحت میں نبوت کے درجہ کو اس معیار کی حیثیت سے پست قرار دیدیا اور اُنھوں نے انبیاء کے آبا و اجداد میں کفر و شرک کے دھبّے تو ممنوع قرار نہیں دیا۔ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے والد کو حقیقی طور سے آزر بت تراش قرار دے کر بہت کشادہ پیشانی سے اُن کو بت پرست کافر زند قرار دیدیتے ہیں اور رسالت مآبؐ کی والدہ حضرت آمنہ اور جدامجد عبدالمطلبؑ کے کافر و مشرک ہونے کا فتویٰ صادر کرتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں جو انبیاء کی توصیف کی ہے اس میں صاف انبیاء کے آباؤ اجداد کے طہارت ایمان کو ظاہر فرمایا ہے۔ (نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۰۱) فاستودعہم فی افضل مستودع واقرّھم فی خیر مستقرّ تناسختھم کرائم الاصلاب الی مطہرات الارحام کلما مضی منھم سلف قام بدین اللہ خلف حتی افضت کرامۃ اللہ سبحانہ الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ فاخرجہ من افضل المعاون منبتا واعزّ الارومات مغرسا من الشجرۃ التی صدع منھا انبیاءہ وانتجب منھا امناءہ عترتہ خیر العتر واسرتہ خیر الاسر وشجرتہ خیر الشجر۔

"خدا نے اُن کو بہترین جگہوں پر ودیعت کیا اور بہترین مقاموں

اُن کو جگہ دی۔ اُن کو دست بدست منتقل کیا بزرگ مرتبہ پشتوں نے پاک و پاکیزہ شکموں کی طرف جب ان میں سے کوئی پیش رو گذر افوراً کھڑا ہوگیا دین خدا کی تبلیغ کے لئے کوئی اُسکا قائم مقام یہانتک کہ پہونچا خدا کا اعزاز حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ہستی تک تو خدانے اُن کو ظاہر کیا ایسی جواہرات کی کان سے جہاں کی پیداوار بہتر سے بہتر اور ایسے بزرگ اصل د ب سے جہاں کی زراعت سب سے زیادہ معزز و ممتاز تھی، ایسے شجرہ سے کہ جس سے خدا نے اپنے انبیاء کو خلق کیا اور جہاں سے اپنے امانت دار بندوں کو منتخب کیا ہی۔ آپ کی نسل تمام نسلوں سے بہتر اور آپ کا گھرانا تمام گھرانوں سے افضل اور آپکا شجرہ تمام شجروں میں بہتر ہے۔"

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہی کہ ایک کافر صلب اور آغوش کرائم اصلاب اور مطہرات ارحام میں کسی طرح داخل نہیں ہوسکتی۔

(۸)

ختم نبوت

شیعوں کا عقیدہ ہے جس میں اکثر دوسری جماعتیں بھی مسلمانوں کی ان کے ساتھ متفق ہیں۔ بلکہ سوائے قادیانی گروہ کے تمام مسلمانوں کا

اجماع ہے کہ نبوت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہے اور آپکے بعد نبوت و رسالت اور وحی و پیغام خداوندی کا دروازہ بند ہوگیا۔ امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ نے نہج البلاغہ میں اس عقیدہ کی تصریح فرمائی ہے۔

ملاحظہ ہو (ج ا ص ۲۷) ارسلہ علی حین فترۃ من الرسل و تنازع من الالسن فقفی بہ الرسل وختم بہ الوحی۔

"خدا نے اُن کو مبعوث کیا اُس وقت جب پیغمبروں کی فترت کا زمانہ تھا اور لوگوں کی زبانیں باہم مختلف تھیں تو خدا نے اُن کو پیغمبروں کی آخری فرد قرار دے کر وحی کے سلسلہ کو اُن کے اوپر ختم کر دیا۔"

یہ ہے امیر المومنینؑ کا ارشاد جس سے بڑھ کر حقیقت نبوت کا عارف دنیا کے پردہ پر پیدا نہیں ہوا تھا

(۹)

امامت و خلافت

یہ مسئلہ آپس کی مناظرہ بازیوں سے اتنا پیچیدہ، اہم اور مختلف فیہ ہوگیا ہے کہ اُس میں کسی نقطۂ واحد پر فریقین کا اجتماع ناممکن اور محال معلوم ہونے لگا ہے۔

لطف یہ ہے کہ تیرہ سو برس سے اس مسئلہ کے متعلق لکھا جاتا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن اب تک فرقۂ شیعہ کے نقطۂ نظر کے متعلق دنیا کو غلط فہمیاں ہیں۔ اور وہ جب شیعی خیالات کو پیش کرتی ہے تو انھیں غلط صورت سے ظاہر کرتی ہے۔

میں اس کے پہلے کہ امیرالمومنینؑ کے مخصوص کلمات جو اس بحث سے تعلق رکھتے ہیں پیش کروں، چاہتا ہوں کہ خود شیعی نقطۂ نظر کو ذرا واضح طور سے تحریر کر دوں۔

واضح ہو کہ شیعہ امامت و خلافت بمعنی حکومت کو ایک ہی چیز نہیں سمجھتے ہیں۔

امامت جو حقیقی رسول کی جانشینی اور قائم مقامی کی حیثیت رکھتی ہے اُس کے معنی یہ ہیں کہ رسول کے بعد ایک ایسی ہستی ہو جو صفات و کمالات عصمت اور ہدایت خلق میں رسول کے کمالات کا آئینہ اور سچی تصویر ہو وہی وہ ہوگا جس کی اطاعت بحکم خدا واجب ہوگی اور اُس کے احکام کا اتباع ایک مذہبی فریضہ اور شاہراہ ہدایت پہ قائم رہنے کا ذریعہ ہوگا۔

خلافت بمعنی حکومت وہ ظاہری سلطنت اور فرمانروائی ہے جس سے ملک کا نظم و نسق درست ہو اور شیرازۂ قومی مسلمانوں کا منتشر ہونے

سے محفوظ رہے۔

دنیا میں امام کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ خدا کی حجت تمام رہے اور زمین حجت خدا سے خالی نہ ہو اور ہدایت خلق کا امکانی ذریعہ موجود رہے اور دنیا میں بیشک بادشاہ، حاکم، فرمانروا کی بھی ضرورت ہے جس سے ملک کے نظم و نسق میں ابتری نہ پیدا ہو۔ اور ہیئت اجتماعیہ کی حفاظت ہو۔

دنیا کے سیاسی نظام اور قانون کے اعتبار سے ایسے بادشاہ اور حاکم کا ہونا بہرحال ناگزیر ہے۔ اور اس شعبہ کو صرف اُس کے مفاد کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اُس میں عصمت یا عدالت بلکہ اسلام کی بھی قید نہیں ہے اور مسلم اور غیر مسلم کی بھی تفریق نہیں۔

اس وقت بہرحال حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا بادشاہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ اس لئے کہ اسلامی مردم شماری کا اکثر و بیشتر حصہ بواسطہ یا بلاواسطہ اس وقت برطانیہ کی حکومت میں ہے اور اُس کی رعیت میں داخل ہے۔

بے شک دنیا کی عام فطرت کے مطابق مسلمان بادشاہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو شخصی حیثیت سے زیادہ نفع اور غیر مسلم بادشاہ ہونے کی صورت میں غیر مسلموں کو زیادہ منفعت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا

اصل حکومت کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ایسے سلاطین کی حکومت وسلطنت قائم ہو جانے کے بعد اُن کے احکام کی اطاعت اور قانون کی پابندی بھی امن وامان ملکی کی حفاظت کے تحت میں ضروری ہوگی اور بغاوت کرنا جرم بھی سمجھا جائیگا۔

اس اعتبار سے یہ شعبہ مستقل اور بالکل مستقل ہے جس میں سوائے قابلیت انتظام اور حصول غلبہ کے کوئی شرط نہیں ہے جس طرح پہلا شعبہ بھی بالکل مستقل ہے یعنی ایک امامؑ ہادی خلق کی صفت ذاتی امامت وعصمت اور حقیقی خلافت یعنی صفات وکمالات میں رسول کی جانشینی کبھی ظاہری تاج وتخت اور حکومت وسلطنت کی پابند نہیں ہے اور نہ رسم بعیت وغیرہ پر موقوف۔

ایک نبی نبی ہے چاہے دنیا اُس کی تکذیب کرتی رہے۔ اُسی طرح ایک امام امام ہے چاہے کوئی اُس کی بات سننے اور اُن کے اقوال پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا

اس اعتبار سے یہ دونوں شعبے بالکل الگ الگ ہیں اور ان میں کوئی اتحاد نہیں ہے۔ لیکن اسلام چونکہ ایک عملی مذہب ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اس لئے مذہبی تعلیمات جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اُسی طرح اجتماعی

زندگی اور ملکی اور معاشرتی حالات کے ساتھ بھی۔ اس صورت میں اگر امام روحانی الگ اور سلطانِ دنیوی الگ ہو۔ اور یہ سلطان بالکل اپنے کاموں میں خود مختار ہو اور امام کے احکام کا مطیع ومتبع نہ ہو تو امامت ایک روح بے جسد اور عملی حیثیت سے بیکار ہو جاتی ہے۔ اور اگر بادشاہ ہر امر میں امام کے احکام کا تابع ومطیع اور اپنے احکام میں غیر مستقل ہو تو درحقیقت وہ ایک کارکن سے زیادہ نہیں ہے جو امام کے احکام کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اسی طرح اُس کو مستقل بادشاہ اور فرمانروا کہنا بالکل غلط ہے۔

اس لئے عقلی بنیاد پر مذہبی ودنیوی دونوں نقطہ نظر سے ان دونوں شعبوں کے سموئے جانے کی ضرورت ہے۔ یعنی اسلامی تمدن کی بنا پر سلطنت، حکومت اور فرمانروائی امام خلیفۂ رسولؐ اور روحانی معصوم پیشوا کا حق ہے، جو اگر اُن تک پہونچ جائے تو خیر، اور اگر نہ پہونچے تو جو شخص حکومت وفرمانروائی کا مالک بنے وہ بہر حال حاکم، بادشاہ، فرمانروا، سب کچھ کہا تو جائے ہی گا اور ہو جائیگا لیکن وہ حق غیر پر متصرف اور ناجائز قابض سمجھا جائیگا۔ اور کسی طرح عادل حاکم نہیں سمجھا جاسکتا

معلوم ہوا کہ حکومت وخلافت کے سلسلہ میں تین حیثیتیں پیدا ہوتی ہیں ایک سیاسی وملکی نقطۂ نظر سے ایک حاکم وبادشاہ کی ضرورت۔

اس اعتبار سے عادل غیر عادل بلکہ مسلم و غیر مسلم میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

دوسرے مذہبی نقطہ نظر سے رسول کے بعد ایک امام، پیشوا، حجت علی الخلق کی ضرورت۔ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ ظاہری فرمانروائی اُس کے پاس ہو یا نہ ہو۔

تیسرے اسلام کے تمدنی نقطۂ نظر سے جس کی بنا پر وہ پہلے شعبہ والی حکومت و خلافت دوسرے شعبہ کے مالک یعنی نبی کے بعد اُس کے صحیح جانشین امام کا حق ہے۔

جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے، تاریخی ناقابل انکار حقیقت کی بنا پر شیعہ حضرات خلفائے ثلثہ کی خلافت یعنی حکومت کے معترف اور قائل ہیں اور اس کا انکار نہیں رکھتے۔

دوسری حیثیت کے اعتبار سے مذہبی ناقابل انکار نصوص، آیات و احادیث اور عقلی دلائل کی بنا پر شیعہ حضرت رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت کی عترت اور اہلبیت کی امامت کے قائل ہیں جن میں سے سب کے اول حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام ہیں

تیسری حیثیت کے لحاظ سے شیعہ مجبور ہیں کہ وہ خلافت و حکومت کو بھی اہلبیت کا حق خیال کریں اور دوسرے لوگوں کی بادشاہت و حکومت کو جو ناقابل انکار حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تسلیم تو کریں مگر اُسے حق غیر ہونیکے

اعتبار سے جائز سلطنت نہ سمجھیں۔

نہج البلاغہ میں ایسے بیانات موجود ہیں جو ان تینوں حیثیتوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بعض بیانات پہلی حیثیت سے متعلق ہیں اور بعض دوسری اور بعض تیسری سے تعلق رکھتے ہیں

دنیا جو ان حقائق سے بیخبر ہے، غلط فہمی میں مبتلا ہوتی ہے۔ اور ایک شعبہ کے متعلقہ بیانات سے دوسرے شعبہ میں غلط استدلال کرتی ہے۔ اور گمراہی میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان تینوں قسموں کے بیانات کو علٰحدہ علٰحدہ درج کریں اور غلط فہمی کے پردوں کو چاک کرتے جائیں۔

خلافت کی پہلی حیثیت یعنی حکومت و سلطنت

ہم نے بیان کیا کہ یہ وہ چیز ہے جس کی سیاسی نقطۂ نظر اور نظام ملکی کی حیثیت سے سخت ضرورت ہے اور بغیر اس کے ملک کا انتظام درست نہیں ہو سکتا اور حدود سلطنت کی حفاظت [illegible] میں امن و امان اور ڈاکے وغیرہ کے واقعات کا سد باب اور [illegible] کے مقدمات کا فیصلہ اور قانونی و سیاسی [illegible] کی سزا سب اسی شعبہ کے تحت میں داخل ہوتی ہے۔ اس [illegible]

بے شک صرف ایک بادشاہ، حاکم کی ضرورت ہے جس میں سوائے قوت انتظام کے اور کوئی بات ہونے کی شرط معلوم نہیں ہوتی اس میں تقوی و عدالت کا کیا ذکر اسلام اور کفر کی بھی تفریق نہیں ہے بیشک دنیا کے اقتضائے طبع کی بنا پر مسلمان بادشاہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کو زیادہ دنیاوی نفع اور غیر مسلم بادشاہ ہونے کی صورت میں غیر مسلموں کو زیادہ نفع پہونچے گا۔ لیکن اصل سلطنت و حکومت کا مفاد بہرحال حاصل ہو جائیگا۔

اس کو امیر المومنین حسب ذیل بیان میں ارشاد فرماتے ہیں۔

(نہج البلاغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱) انہ لابد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرتہ المؤمن ویستمتع فیھا الکافر ویبلّغ اللہ فیھا الاجل ویجمع بہ الفیئ ویقاتل بہ العدو وتامن بہ السبل ویوخذ بہ للضعیف من القوی حتی یستریح برّ ویستراح من فاجر.

"لوگوں کے لئے بہرحال ایک فرمانروا کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ نیکو کردار ہو یا فاجر و بدکردار۔ اُس کی حکومت میں مومن اپنا کام کرے گا۔ اور اُسکی حکومت میں کافر لوگ فائدہ اٹھائیں گے اور اس حکومت میں خدا اپنی مقررہ مدت کو پورا کرے گا۔ اور اسکے سبب سے لگان ٹیکس خراج وغیرہ وصول ہونگے اور راستوں میں امن

قائم ہوگا۔ اور کمزوروں کا حق زور آوروں سے حاصل کیا جا سکے گا یہاں تک کہ اُس حکومت کی مدت ختم ہو۔ اور (اگر مومن کی حکومت ہو تو) وہ مومن غم دہر کی کشاکش سے نجات پائے اور (اگر کافر و فاجر کی حکومت ہو تو) اُس فاجر بدکار سے خلق خدا کو چھٹکارا ملے۔

دوسری روایت میں ہے کہ:۔

اما الامرۃ البرۃ فیعمل فیھا التقی واما الامرۃ الفاجرۃ فیتمتع فیھا الشقی الی ان تنقطع مدتہ وتدرکہ منیتہ

"نیکو کار حکومت میں متقی و پرہیزگار انسان مصروف عمل ہوتا ہے اور فاجر و بدکار حکومت میں بدبخت روزگار (بُرے) لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں یہانتک کہ اُس حاکم کی مدت ختم ہو اور اُس کی اجل آکر اُس پر قبضہ کرے"

الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نظام دنیا اور قانون عادت کے مطابق فرماتے ہیں کہ انتظام ملکی و اجتماعی کے لئے ایک نہ ایک بادشاہ اور فرمانروا ہوگا ضرور، چاہے وہ مومن ہو چاہے کافر۔ مومن ہوگا تو مومنین کو نفع حاصل ہوگا، کافر ہوگا تو کافروں کو۔

اس کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ اسلام کا مقصود کس طرح کی حکومت ہے۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے حاکم ہونے کا معیار کیا ہے؟

ورنہ اگر اُس کو اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی تعلق ہے تو کوئی بتائے کہ
کیا کافروں کو نفع حاصل ہونا اور بدبخت روزگار افراد کا متمتع ہونا
اسلام کے نقطۂ نظر میں داخل ہے اور وہ اس قسم کی حکومت کو
پسند کرتا ہے۔

وہ لوگ جو امیر المومنینؑ کے اس کلام کو مختلف فیہ مسئلہ امامت
و خلافت کے متعلق بطور استدلال کے پیش کرتے ہیں وہ ذرا آنکھیں
کھول کر دیکھیں اور غور کریں کہ اس کو محل اختلاف امامت سے کیا
تعلق ہے۔

آخر اُس امامت کے لئے اُنھوں نے بھی تو کچھ شرائط قرار
دئیے ہیں عصمت اور غیر جائز الخطا ہونا نہ سہی لیکن عدالت، وہ بھی
لا ینعزل الامام بالفسق کی بنا پر بقاء کے طور پر نہ سہی لیکن شروع
شروع ظاہری عدالت، وہ بھی نہ سہی، اسلام کی تو شرط قرار دی
ہے۔ لیکن امیر المومنینؑ اس کلام میں وہ شرط بھی نظر انداز کرتے
ہیں اور فرماتے ہیں کہ حاکم یا نیکوکار مسلمان ہوگا یا فاجر۔
جس سے کافروں کو فائدہ حاصل ہو۔ پھر آخر یہ کلام حضرت کا
امامت بمعنی مصطلح سے متعلق کیونکر ہو سکتا ہے؟

بیشک یہ سلطنت اور حکومت امور سیاست کے ساتھ متعلق ہے

اور اُس میں یقیناً عصمت کیسی، عدالت کیسی، اسلام کی بھی شرط نہیں
ہے۔ وہ "ہر کسے کہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مصداق "جس کی لاٹھی
اُس کی بھینس" کے اصول پر قہر و غلبہ کا نتیجہ یا جمہور کے آراء اور
نمایندگان کی قرارداد کے مطابق "اجماع" کا اثر یا کسی منتخبہ کمیٹی کے
فیصلہ کا ثمرہ ہو سکتی ہے جس کے بعد ایک شخص حاکم، بادشاہ بن جائیگا
چاہے وہ عادل، متقی، پرہیزگار کیسا مسلم بھی نہ ہو کافر ہو۔

کون انسان ہے جو ہلاکو اور چنگیز خاں کی اپنی اپنی ہیئت میں
حکومت و فرمانروائی کا منکر ہو سکے اور کون متنفس ہے جو نپولین اور
قیصر جرمن کی سلطنت کا انکار کر سکے۔

ہرگز نہیں، اس سلطنت کی کامیابی بھی بے شک ملکی انتظام،
حدود مملکت کی حفاظت، اور توسیع حدود سلطنت، انتظامی خرابیوں
کے دفعیہ اور چور اور ڈاکو طبقہ کے قلع و قمع، استیصال وغیرہ میں
مضمر ہے اور ممکن ہے کوئی ایسا بادشاہ اپنی رعیت کے بارے میں ایک
حد تک انصاف اور عدالت سے بھی کام لیتا ہو اور نسبتہً اپنی
رعیت کے معاملات میں کسی حد تک خدا سے ڈرتا بھی ہو، اور احکام
شرع کی پیروی کرتا ہو۔ یقیناً اُس کی تعریف ان اوصاف پر صحیح
ہوگی۔ آخر نوشیرواں کی عدالت اُس کے نام کا جزو بن گئی

یا نہیں۔ حالانکہ وہ مسلمان نہیں کافر تھا۔

اس ملکی بادشاہت کی کامیابی اور اچھائی سے کسی طرح اُس بادشاہت کی نوعیت نہیں بدل سکتی۔ اور نہ اُس کی حقیقت میں انقلاب ہو سکتا ہے۔

موجودہ بدتر سے بدتر حالات کی بنا پر کبھی امیر المومنین ؓ نے سابقہ دورِ حکومت کو یاد کرکے اُس کے انتظام کا کسی قدر خوش آیند الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:۔

للہ بلاد فلان۔ فقد قوّم الاود وداوی العمد خلف الفتنۃ واقام السنّۃ ذھب نقیّ الثوب قلیل العیب اصاب خیرھا وسبق شرّھا ادّی الی اللہ طاعتہ واتّقاہ بحقہ رحل وترکھم فی طرق متشعبۃ لا یھتدی فیھا الضّال ولا یستیقن المھتدی۔۔

"کیا کہنا ہے فلاں آدمی (بعض شارحوں نے لکھا ہے کہ یہ خلیفہ دوم حضرت عمر کا ذکر ہے۔ اگرچہ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن یہاں اسی مفروضہ کی بنا پر اس کو زیر بحث لایا گیا ہے) کے زیر انتظام شہروں کا، اُنھوں نے ٹیڑھے کو سیدھا کیا اور بیماری کا علاج کیا۔ شورش اور فتنہ و فساد کو اپنے بعد کے لئے چھوڑا اور خود راستہ قائم کر گئے۔ وہ گئے صاف کپڑوں کے ساتھ اور کم عیب رکھنے کی حالت میں

وکم کی لفظ یاد رکھنے کے قابل ہے)، اُنھوں نے اس حکومت سے فائدہ اٹھا لیا۔ اور مصرت کا وقت آنے سے پہلے ہی چلے گئے۔ انھوں نے اس میں خدا کے احکام کی پابندی کی اور اُس سے خوف سے کام لیا۔ وہ چلے گئے اس حالت میں کہ لوگوں کو متفرق شعبوں میں چھوڑ گئے ہیں جن میں گمراہ آدمی کو تو راستہ ہی نہیں مل سکتا' اور سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو بھی شبہہ پڑ جاتا ہے کہ کہیں یہ راستہ غلط تو نہیں ہے۔"

میں جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں مجھے سلّم الادب کی حکایت یاد آجاتی ہے' ایک غلام تھا بیچارہ ایسے مالک کے قبضہ میں جو خود اچھے اچھے خرمے کھاتا تھا۔ بُرے غلام کو کھانے کو دیتا تھا۔ غلام کو یہ بات ناگوار ہوتی تھی۔ اُس نے خواہش کرکے اپنے تئیں دوسرے مالک کے ہاتھ فروخت کرا لیا۔ وہ ایسا کہ بُرے خرمے بھی خود ہی کھا لیتا اور غلام کو صرف کوڑا کرکٹ خرموں کا دیدیا کرتا تھا۔ اُس سے بھی غلام نے اپنے فروخت کرنے کی خواہش کی۔ اور تیسرے مالک کے پاس پہونچا۔ وہ ایسا کہ غلام کو فاقوں مارتا' کچھ کھانے کو نہ دیتا تھا۔

یقیناً اُس کے لئے پہلے مالک ہزار درجہ اچھے تھے اور وہ اُنکی تعریف کرتا تو غلط نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی حالت حضرت رسالت کی آنکھ

بند ہوتے ہی اس بیچارہ بیکس و بے بس غلام کی سی ہو گئی تھی۔

پہلے اور دوسرے دور کی سلطنت کے جواز و عدم جواز کی بحث اپنے مقام پر، اور اس سلطنت کے ذرائع حصول میں اُس کے جائز حقداروں کے ساتھ جو برتاؤ کئے گئے وہ بھی ایک طرف، ان تمام باتوں کو چھوڑ کر یہ یقینی امر ہے کہ ان دونوں دوروں میں عام مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص سختی اور تشدد، اموال مسلمین میں کوئی غیر معمولی تغلب و تصرف، حقوق مسلمین کے مقابلہ میں خاص اپنے آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ مراعات اور جانبداری کا دروازہ کھلنے نہیں پایا تھا، حدود شرعیہ کا اجرا ہوتا تھا۔ حضرت عمر نے اپنے بیٹے کو بھی شراب پینے پر (لیت و لعل کے بعد سہی) حد جاری ہونے سے مستثنیٰ ہونے کی تحریک نہیں کی، ملک کے انتظامات میں صرف اپنے عزیزوں کو بھر نہیں دیا اور رسول کے بعض محترم صحابہ، ابوذر، عمار، عبداللہ بن مسعود وغیرہ کو زد و کوب نہیں کیا گیا۔

یہ تمام چیزیں وہ تھیں جو تیسرے دور میں عملی حیثیت سے سامنے آگئی تھیں۔ اس لئے تمام صحابہ اس دور کی صورت حال کے بنا پر سابق دوروں کا تذکرہ کرتے اور اُس کی تعریف کرتے تھے۔

حضرت علی کو پہلے دوروں میں جو شکایت تھی وہ اپنے متعلق تھی کہ

مجھے میرے حق سے محروم کیا گیا اور مجھ پر ظلم ہوا جسے آپ نے اعلان حق کی صورت میں ظاہر کر دیا تھا، اور اعلان حق کا فرض ختم ہونے کے بعد آپ نے سکوت فرما لیا تھا اور پھر کاربارِ حکومت میں آپ نے کوئی دخل اندازی نہیں کی۔

لیکن اس موجودہ دور میں آپ کے دل کو روحانی تکلیف اُن مختلف صحابہ کے اوپر ہونے والے مظالم سے ہوتی تھی جنھیں آپ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کے حالات سے آپ اپنے معاملہ سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ اُس کو آپ نے صاف طور سے ظاہر بھی فرما دیا تھا اُسی وقت جب حضرت عثمان کی بیعت کا مسئلہ پیش تھا کہ میں اُس وقت تک صبر و تحمل سے کام لے سکتا ہوں جب تک ظلم اور ناانصافی صرف میرے ساتھ ہو۔

ملاحظہ ہو ص ۱۲۵

من کلام لہ علیہ السلام لما عزموا علی بیعۃ عثمان لقد علمتم انی احق الناس بہا من غیری و واللہ لاسلمنّ ما سلمت امور المسلمین ولم یکن فیہا جور الا علیّ خاصۃ۔

"تمھیں معلوم ہے کہ میں اس حکومت کا اپنے سوا ہر شخص سے زیادہ مستحق ہوں، اور خدا کی قسم میں سر تسلیم خم کرتا رہونگا اُس وقت تک کہ

جب تک مسلمانوں کے معاملات ٹھیک سے ہوتے ہیں، اور جو کچھ ناانصافی ہوتی ہو وہ صرف میرے ساتھ"۔

اب ذرا ناظرین اس کلام کی روشنی میں اُس تعریف پر نظر ڈالیں جو حضرت نے دورِ سابق کی فرمائی ہے اور للہ بلاد فلاں کا سرنامہ دیکھیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ تعریف صرف ممالک و بلاد کے انتظام کی حیثیت سے ہی جو ایک بادشاہ کی بادشاہت کا مفاد ہے اور پھر قلیل العیب کا فقرہ دیکھیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ تعریف بلحاظ اس کے ہی ہے کہ موجودہ دور کی نسبت عیوب کم تھے، نہ یہ کہ وہ دور بالکل ہر حیثیت سے مکمل تھا اور اُس میں خرابی ہی نہ تھی۔ اس سے پتہ چلیگا کہ ادّی الی اللہ طاعتہ، اضافی حیثیت سے بہت اُن امور سے متعلق ہے جن میں اب مسلمانوں کے ساتھ انتہائی جبر و تشدّد اور عدم مساوات کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔

اس کو سابق دور کی سلطنت کے جواز اور امامت وخلافت کے استحقاق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

امامت کے متعلق حضرت کا نقطۂ نظر کیا تھا، اور اس کے لئے حضرت کیا شرائط ضروری سمجھتے تھے، وہ دوسرے شعبہ سے متعلق ہے جس کے لئے انتظار کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا حیثیت کی حکومت جیسا کہ ہم نے تحریر کیا اپنے سیاسی بنیاد کے اعتبار سے سوائے انتظام ملکی اور غلبہ وطاقت، کسی شرط کی پابند نہیں ہے اور اس میں عدالت تو کجا اسلام کی بھی شرط نہیں ہے لیکن مسلمانوں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد باوجودیکہ خلافت کو صرف مادی نقطۂ نظر سے دیکھا اور حکومت وانتظام ملکی ہی کے معنی میں قرار دیا پھر بھی اسلامیت کے مظاہرہ میں انھوں نے اس کے لئے کچھ شرائط وخصوصیات مقرر کر دئے جن کے اوپر ایک داخلی قانون رواجی کی حیثیت سے اس حکومت کی بنیاد قرار پاگئی اور اسی کے اوپر پہلی اور اُس کے بعد کی انتظامی عمارتوں کی شکست وریخت ہوئی۔

اس کے لئے علاوہ اسلام، ذکوریت، قرشیت وغیرہ کے اجماع اہل حل وعقد کا طریقہ مقرر کیا گیا اور اس میں یہ شرط کی گئی کہ اہل حل وعقد سے مراد صرف مدینۂ رسول کے رہنے والے مہاجرین و انصار ہیں اور جب یہ کسی ایک شخص پر اتفاق کر لیں تو وہ پھر تمام عالم اسلامی کیلئے مسلم ہوگا۔ اور باہر والوں کو اس میں کچھ چون وچرا کا حق نہ ہوگا۔ نیز خود مدینہ میں موجود ہونے والوں کو قرارداد ہو چکنے کے بعد کسی نظرِ ثانی اور غور وتامل کا اختیار بھی باقی نہ رہے گا۔

آپ کے ساتھ منازعت کی۔

امیر شام کی منازعت بھی آپ کے ساتھ امامت بمعنی خلافت حقہ سے تعلق نہ رکھتی تھی اس لئے کہ اُسکا تو تعلق ہی اُن لوگوں نے نہ کیا تھا اس پر نزاع کے کیا معنی بلکہ نزاع اسی مادی حیثیت والی ظاہری سلطنت سے متعلق تھی جس کے کچھ اصول و آئین مسلمانوں کی جانب سے قرار دئے جا چکے تھے اور امیر المومنین ان ہی اصول کے مطابق منتخب ہو چکے تھے۔

اس موقع پر امیر المومنینؑ کا میدان مقابلہ اپنے مخالف امیر شام کے ساتھ صرف اسی سلطنت کے متعلق تھا جو اب چوتھے دور میں قرارداد اصول کے مطابق آپ کے پائے نام ہوئی تھی اس لئے آپ کو اپنے دشمن کے مقابلہ میں اگر کچھ دلائل پیش کرنا ہوں اور موجودہ معرکۂ نزاع میں اپنا استحقاق ثابت کرنا ہو تو وہ انہی اصول و شرائط کی بنیاد پر ہونا چاہیئے جو مسلمانوں میں اس وقت طے شدہ حیثیت پا چکے تھے۔ اور اس حیثیت سے بھی حق آپ کے ساتھ تھا اور انہی اصول کے مطابق آپکے اپنے مخالف پر حجت کو تمام کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی ملاحظہ ہو حضرت کا وہ خط جو آپ نے امیر شام کے نام تحریر فرمایا ہے

نہج البلاغہ جلد ۲ صـ۷

اسی بنیاد پر پہلی خلافت ثابت ہوئی اور اسی کے نتیجہ میں بذریعۂ استخلاف دوسری اور اسی کی تبعیت میں بطور شوریٰ تیسری۔ امیر المومنینؑ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرینگے اپنے تئیں روحانی ریاست یعنی امامتِ حقہ کا حامل جانتے تھے اور اس لئے سلطنت کا بھی اپنے تئیں حقدار سمجھتے تھے۔ لیکن دنیا نے پہلے جزو کے تو کبھی معنی کا تصور نہیں کیا، تصدیق کیسی۔ اس نے ظاہری سلطنت کے علاوہ امامت کی کوئی اصلیت ہی نہیں قرار دی تاکہ وہ امیر المومنینؑ کے لئے اس مرتبہ پر فائز ہونے کا پہلے یا بعد کبھی اقرار کرتی۔ بیشک دوسرے جزو کے متعلق اس نے اگرچہ اول و دوم و سوم دور تک آپکے دعوی کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن چوتھے دور میں اس منصب کو آپکے لئے قرار دیا۔ مگر نہ اس بنیاد پر جس بنیاد پر آپ اُس کے شروع سے مدعی تھے۔ یعنی اس لئے کہ آپ امام روحانی نہ تھے لہذا سلطنت آپ کا قدرتی حق ہے۔ اس حیثیت سے دنیا نے اگر تسلیم کیا ہوتا تو پہلے ہی دن سے تسلیم کرتی چوتھے نمبر کے کوئی معنی نہ تھے۔

بلکہ اُس نے سلطنت کو صرف سلطنت ہونے کے اعتبار سے اسی اصول و قرارداد کی بنیاد پر جو رواجی اور عملی حیثیت میں اس کے لئے مقرر ہو چکی تھی آپ کے لئے تسلیم کیا۔ جس میں امیر شام معاویہ بن ابی سفیان

"انه بايعني القوم الذين بايعوا ابابكر وعمر وعثمان على ما بايعوهم
عليه فلم يكن للشاهد ان يختار ولا للغائب ان يرد و انما الشورى
للمهاجرين والانصار فان اجتمعوا على رجل وسموه اماما كان ذلك
رضى فان خرج عن امرهم خارج بطعن او بدعة ردوه الى ما خرج
منه فان ابى قاتلوه على اتباعه غير سبيل المؤمنين وولاه الله
ما تولى۔"

"اُنہی لوگوں نے کہ جنھوں نے ابو بکر، عمر، عثمان کی بعیت
کی تھی اب مجھ سے بعیت کی ہے۔ اسی اصول پر جس پر ان کی بعیت
کی تھی لہذا اس اصول کے مطابق (موجود ہونے والے کو (مدینہ
میں) یہ حق نہیں کہ وہ پھر نظر ثانی کرے اور نہ (مدینہ میں) غیر موجود
اشخاص کو یہ حق ہے کہ وہ اس فیصلہ کو مسترد کریں۔ اور مشورہ کا حق
صرف مہاجرین اور انصار (ساکنین مدینہ) کو ہے لہذا وہ اگر مجتمع
ہو جائیں کسی شخص کے اوپر اور اُس کا نام رکھ دیں امام (خلیفہ)
تو اسی پر بس راضی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص مخالفت
کرے کسی اعتراض کی بنا پر یا کسی بدعت کی ایجاد کر کے تو یہ لوگ
اُسے واپس لانے کی کوشش کرینگے اور اگر وہ انکار کرے تو پھر
یہ لوگ اس سے جنگ کرینگے اس لئے کہ اُس نے مومنین کے

راستہ کو ترک کیا تو خدا اُس سے ہاتھ اُٹھائے گا اور جانے دے گا
جدھر جائے۔"

دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں (ص)

لانها بيعة واحدة لا يثنى فيها النظر ولا يستأنف فيها الخيار
الخارج منها طاعن والمروي فيها مداهن۔

"کیونکہ یہ بعیت تو بس ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے نہ اس میں نظر ثانی
کی جا سکتی ہے اور نہ از سر نو اختیار ہو سکتا ہے۔ جو شخص اس سے
خارج ہو وہ باغی سمجھا جائے اور جو اس میں لیت و لعل سے کام
لے وہ منافق خیال کیا جائے۔"

بے شک یہ اُس صورت اور موقع کے لحاظ سے جو آپ میں اور
امیر شام میں ما بہ النزاع تھی متعینہ طریق استدلال ہے جس کے سوا
کچھ ہونا صحیح ہی نہیں ہے کیونکہ پہلی دوسری تیسری خلافتوں کی صحت
و عدم صحت کا سوال تو ختم ہو چکا ہے اور گذر گیا۔ اب صورت واقعہ
یہ ہے کہ تیسرے دور کے بعد بحیثیت چوتھے خلیفہ ہونے کے حضرت علیؑ
کو امر سلطنت کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اور امیر شام مدعی ہیں کہ مقتول
خلیفہ سے رشتہ داری کی بنا پر میں اس کا حقدار ہوں تو اب امیر شام
کے مقابلہ میں تو جو دلیل پیش کی جائے وہ اُسی صورت واقعہ سے

متعلق ہونا چاہیے جو خلفائے ثلثہ کے دور خلافت کے بعد پائی جاتی ہیں
رہ گئی اصولی بحث کہ آیا پہلے ہی خلفا کی خلافت درست تھی
یا نہیں یا یہ کہ امامت روحانی اصل میں کس کا حق ہے، وہ نہ اس
وقت مابہ النزاع ہے نہ اس پر کوئی بحث کرنے کا اور دلیل قائم
کرنے کا محل ہے۔

اس صورت میں امیر المومنینؑ کے اس استدلال کو خلافت کی
اصولی بحث میں پیش کرنا اور امامت کے مختلف فیہ مسئلہ کی سند
قرار دے کر یہ کہنا کہ امیر المومنین کا بھی نقطۂ نظر وہی تھا جو عام
مسلمانوں کا ہے واقعیت سے چشم پوشی اور عام اشخاص کو فریب
دہی نہیں تو اور کیا ہے

خلافت کی دوسری حیثیت یعنی امامت

(دوسری حیثیت) کی امامت جو حقیقتاً ریاست روحانی اور
خدا کی طرف کا منصب ہے اس کا پتہ امیر المومنین کے کلمات
میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

جلد اول ص۲۹۴ انما الائمۃ قوام اللہ علی خلقہ وعرفاؤہ
علی عبادہ لا یدخل الجنۃ الا من عرفھم وعرفوہ ولا یدخل النار

الا من انکرھم وانکروہ

"ائمہ خدا کی طرف کے مقرر شدہ ذمہ دار ہیں اُس کے خلق کے اوپر،
اُس کے ترجمان و نمایندہ ہیں اُس کے بندوں پر۔ نہیں داخل ہوگا جنت
میں مگر وہ شخص جو اُنھیں پہچانتا ہو اور وہ اُسے پہچانتے ہوں۔ اور
نہیں داخل ہوگا جہنم میں مگر وہ شخص جو اُن سے اجنبی ہو اور وہ
اُس سے اجنبی ہوں۔"

یہ درجہ یقیناً ظاہری سلاطین اور حکام سے تعلق نہیں رکھتا ہے
بلکہ حقیقی منصب داران خداوندی کے متعلق ہے جو اُسی کے مقرر کردہ
ہو سکتے ہیں۔ یہی خدا کی حجت ہو سکتے ہیں اُس کے بندوں کے اوپر۔
ایک اور موقع کے اوپر حضرت نے بتلایا ہے کہ زمین کبھی حجت خدا
سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ملاحظہ ہو حضرت کا ارشاد کمیل بن زیاد
نخعی سے۔ جلد ۲ ص۱۸۰۔

لا تخلو الارض من قائم للہ بحجۃ اما ظاھراً مشھوراً او خائفاً
مغموراً لئلا تبطل حجج اللہ وبیناتہ۔

زمین نہیں خالی رہتی ایک ایسی ہستی سے جو خدا کی حجت تمام کرنیکا
باعث ہو خواہ وہ ظاہر اور معروف و مشہور ہو اور خواہ خوفزدہ
ظلم و جور کے پردوں میں چھپا ہوا ہو تاکہ خدا کی حجتیں اور اُس کے

دلائل باطل نہ ہو جائیں۔"

اس میں غیبت کی صورت پر بھی اشارہ موجود ہے اور حجت خدا کے وجود کی دو صورتیں ایک زمانۂ ظہور اور ایک زمانہ غیبت صاف مذکور ہیں۔

آپ نے امام کے فرائض خصوصی بھی بتلائے ہیں جو خالص مذہبی اور شرعی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

جلد ا ص ۲۱۹

انہ لیس علی الامام الا ما حمل من امر ربہ الابلاغ فی الموعظۃ والاجتھاد فی النصیحۃ والاحیاء للسنۃ واقامۃ الحدود علی مستحقیھا واصدار السھمان علی اھلھا۔

"امام کا جو کچھ فرض ہے وہ وہی ہے کہ جس کا وہ حامل بنایا گیا ہے اپنے پروردگار کے حکم سے بس موعظۂ خلق اور ہدایت میں تبلیغ کے فرض کو انجام دینا اور موعظہ و نصیحت میں جد و جہد صرف کرنا سنتِ الٰہیہ کو قائم کرنا اور مستحقین پر حدود کو جاری کرنا اور زکوٰۃ و خمس وغیرہ کے حقوق کو اُن کے مستحقین تک پہونچنے کا انتظام کرنا"

اس میں نہ انتظام ملکی کا تذکرہ ہے اور نہ فتح ممالک کا آپنے اُس امامت کا پتہ بھی دیدیا ہے کہ وہ اوصاف و کمالات کی بنا پر

صرف بنی ہاشم کے کچھ افراد سے مخصوص ہے فرماتے ہیں:-

جلد ا ص ۲۰۱ ان الائمۃ من قریش غرسوا فی ھذا البطن من ھاشم لا تصلح علی سواھم۔

"ائمہ صرف قریش سے ہونگے اور وہ بھی بنی ہاشم کی اس نسل میں قرار دئے گئے ہیں۔ امامت ان کے غیر کے شایاں ہی نہیں ہے۔"

آپ نے اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ یہ سلسلہ آل محمد علیہم السلام میں ہمیشہ کے لئے جاری ہے اور کبھی زمین حجت خدا سے جو اس نسل سے ہو خالی نہو گی۔

فرماتے ہیں جلد ا ص ۲۱۰

الا ان مثل آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمثل نجوم السماء اذا خوی نجم طلع نجم۔

"آگاہ ہو کہ مثال اہلبیت رسول کی مثل ستارہ ہائے فلک کے ہے۔ جب ایک ستارہ غروب ہوگا تو دوسرا ستارہ طلوع کریگا"

ایک موقع پر آپ نے آخر میں آنے والے امام کا بھی تذکرہ کیا ہے جو زمین کو عدل و انصاف سے معمور کردیگا۔

فرماتے ہیں جلد ا ص ۲۷۵

الا وفی غد وسیاتی غد بما لا تعرفون اخذ الوالی من

غیرھا عمالھا علی مساوی اعمالھا وتخرج لہ الارض من افالیذ کبدھا تلقی الیہ سلماً مقالیدھا فیریکم کیف عدل السیرۃ و یحیی میت الکتاب والسنۃ۔

"آگاہ ہو کہ کل (یعنی آیندہ کے یقینی وقت میں جیسا کہ قیامت کو فردائے قیامت کہا جاتا ہے) اور عنقریب وہ کل آئیگا ایسی صورتوں کے ساتھ جنھیں تم جانتے نہ ہوگے والی امر یعنی حاکم عادل موجودہ حکام سے اُن کی بداعمالیوں کا مواخذہ کرے گا۔ اور زمین اُس کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑوں (خزانوں) کو ظاہر کر دے گی وہ تمھیں دکھلائیگا کہ کیونکر ہوتی ہے عدالت سیرت میں اور زندہ کر دے گا مردہ ہو جانے والی کتاب اور سنت کو۔"

تیسرا امر
یعنی
حکومت و سلطنت حق امام ہی کا ہے

اس کو حضرت علیؑ نے متعدد مقامات پر ظاہر فرمایا ہے اور اسی لئے آپ نے اُن لوگوں کا قبضہ جو اُس پر ناحق متمکن ہو جائیں ناجائز قرار دیا ہے اور اُسے اہلبیت کا حق قرار دیا ہے جنھیں اُنکے اوصاف کے لحاظ سے

رسول اللہؐ نے مقرر فرما دیا تھا۔

ملاحظہ ہو جلد اوّل صفحہ ۳۴۔ اُس وقت جب خلافت کے منصب کو مسلمانوں نے آپکے لئے تسلیم کیا ہے اور مسند سلطنت پر آپ متمکن ہوئے ہیں تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اُس میں فرماتے ہیں۔

لا یقاس بآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ من ھذہ الامّۃ احد ولا یسوّی بہم من جرت نعمتہم علیہ ابدا ھم اساس الدّین وعماد الیقین الیہم یفیئ الغالی وبہم یلحق التّالی ولھم خصائص حق الولایۃ وفیہم الوصیّۃ والوراثۃ الآن اذ رجع الحق الی اھلہ ونقل الی منتقلہ

"آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ اس اُمّت میں سے کسی کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور اُن کے کبھی برابر نہیں ہو سکتے وہ لوگ جو اُن کے ممنون احسان ہیں۔ یہ لوگ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں اُنکی طرف واپس آنا چاہئے اُسے جو اُنھیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے اور اُن تک پہونچنا چاہئے اُس کو جو پیچھے رہ گیا ہو اور اُن کے لئے حکومت و تصرف کے مخصوص حقوق ہیں اور اُن میں رسول کی وصیت اور آپ کی وراثت دونوں کا انحصار ہے۔ آج بے شک حق اپنے مستحق کی طرف واپس ہوا اور وہاں پہونچ گیا جہاں اُسے پہونچنا چاہئے تھا۔"

ان الفاظ سے بالکل صاف ظاہر ہے کہ آپ اُن لوگوں کو جو اس سے پہلے اس منصب پر متمکن تھے غیر مستحق اور نااہل قرار دے رہے ہیں اور حکومت کو مخصوص حق آل محمد کا قرار دیتے ہیں جو اُن میں وصیت یعنی رسول اللہ کی قرار داد کی بنا پر قائم ہے اور وہی وارث رسول بھی ہیں۔

خطبہ شقشقیہ میں جو تاریخی اعتبار سے اہم ترین حیثیت رکھتا ہے آپ نے بہت صفائی سے پہلے خلفاء کے متعلق اپنے خیالات کو ظاہر فرمایا ہے۔

(جلد اوّل صفحہ ۳۴)

(اما واللہ لقد تقمّصها ابن ابی قحافة واللہ لیعلم انّ محلّی منها محلّ القطب من الرّحیٰ ینحدر عنّی السیل ولا یرقیٰ الیّ الطیر۔

"آگاہ ہو خدا کی قسم کہ اس خلافت کے لباس کو ابو قحافہ کے فرزند (ابوبکر) نے زبردستی پہن لیا حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ میری جگہ اُس خلافت میں وہ ہے جو چکّی کے درمیان والے لوہے کی ہوتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو چکّی گردش نہیں کر سکتی، میرا درجہ ایک بڑی پتھر کی چٹان کی طرح بلند ہے جس سے سیلاب کا پانی پھسلتا ہوا نیچے کی طرف بہہ کر جاتا ہے اور بلند پرواز پرند بھی مجھ تک نہیں پہونچ سکتا"

عام نسخوں میں کسی پردہ داری کی مصلحت سے ابن ابی قحافہ کی جگہ (فلاں) کی لفظ رکھ دی گئی ہے لیکن حقیقت حال اس موقع پر اس درجہ

روشن ہے کہ وہ کسی پردہ سے چھپائی نہیں جا سکتی۔ علّامہ شیخ ابن عبدہ نے اس کی شرح میں صاف لکھدیا ہے کہ:۔

الضمیر یرجع الی الخلافة وفلان کنایة عن الخلیفة الاوّل ابی بکر رضی اللہ عنہ۔

"ضمیر یہ خلافت کی طرف راجع ہے اور فلاں کی لفظ کنایہ ہے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے۔"

اس کے بعد یہ امر کسی تصریح کا محتاج نہیں رہتا کہ آپ پہلی خلافت کو بالکل ناجائز سمجھتے تھے جو سنگ بنیاد ہے اس کے بعد کی دوسری خلافتوں کا اور اس خلافت کے تشریف لیجانے کے بعد پھر یہ پوری عمارت ہی بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس خطبہ میں آپ نے اُس کے بعد دوسری اور تیسری خلافت پر بھی سخت الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے جو بالکل ان خلافتوں کے بارے میں آپ کے عقیدہ کا آئینہ بردار ہے۔

اسی لئے بہت سے تنگ نظر افراد کی طرف سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ کم از کم اس خطبہ کو امیر المومنینؑ کے کلام سے خارج کر دیا جائے لیکن خود اہل سنت میں سے تحقیق شیوہ وسیع النظر علماء نے اس کوشش کو نقش بر آب بنا دیا اپنے اُن تصریحات سے جو اس خطبہ کے کلام امیر المومنینؑ ہونے کے متعلق موجود ہیں بلکہ دلائل کے ساتھ انھوں نے

اُن خیالات کو رد کر دیا ہے جو اس کے خلاف پیدا کئے جا سکتے ہیں۔
"نہج البلاغہ کا استناد" جو رسالہ اس کے پہلے شائع ہو چکا ہے
اس میں یہ تصریحات درج ہیں۔

ص۴۷۔ اُس موقع پر جب آپ کو مشورہ دیا گیا ہے کہ طلحہؓ و زبیرؓ کا مقابلہ نہ کیجئے آپ کا جو کلام ہے اُس میں فرماتے ہیں:۔

فواللہ ما زلت مدفوعا عن حقی مستأثرا علیّ منذ قبض اللہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی یوم الناس ھذا۔

"خدا کی قسم مجھے برابر میرے حق سے ہٹایا جاتا رہا اور میرے حقوق پر قبضہ کیا جاتا رہا جب سے حضرت رسولؐ کی وفات ہوئی آج کے دن تک۔"

ص۱۳۵۔ جب حضرت عثمان کی بیعت کا مرحلہ درپیش تھا آپنے فرمایا۔

لقد علمتم انی احق الناس بھا من غیری وواللہ لاسلمن ما سلمت امور المسلمین ولم یکن فیھا جور الا علیّ خاصۃ التماسا لاجر ذلک وفضلہ وزھدا فیما تنافستموہ من زخرفہ وزبرجہ۔

"تم سب کو معلوم ہے کہ میں اس منصب کا سب سے زیادہ حقدار ہوں مگر بخدا میں خاموشی سے کام لیتا رہونگا جب تک کہ مسلمانوں کے معاملات ٹھیک رہیں اور ظلم و ناانصافی جو کچھ ہو وہ صرف میری ذات پر رہے میری یہ خاموشی اجر و ثواب کے حاصل کرنے کے لیئے ہے اور بے رغبتی کا

نتیجہ ہے دنیا کے اُس ساز و سامان میں جس پر تم لوگ جان دے رہے ہو۔"

اس میں آپ نے اپنا مستحق ہونا بھی ثابت کیا ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ اس معاملہ میں شروع سے جو کچھ ہوا وہ آپ کے حق میں ظلم اور ناانصافی کی حیثیت رکھتا ہے۔

ص۳۱۷-۳۱۸۔ ایک شخص نے آپ کے اصحاب میں سے دریافت کیا کہ کیونکر آپ کو ان لوگوں نے اس منصب سے ہٹا دیا حالانکہ آپ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب مسلمانوں کی طرف سے چوتھے درجہ پر آپ کی خلافت تسلیم ہو چکی ہے۔ یہ سوال اس موقع پر اُٹھانا بالکل موقع کے خلاف تھا۔ اس پر آپ نے سائل کو متنبہ بھی فرمایا لیکن پھر بھی آپ نے جو جواب دیا ہے اُس میں اپنی حقیت کا اظہار کر دیا ہے۔ فرمایا:۔

امّا الاستبداد علینا بھذا المقام ونحن الاعلون نسبا والاشدّون برسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نوطا فانھا کانت اثرۃ شحّت علیھا نفوس قوم وسخت عنھا نفوس آخرین والحکم اللہ والمعود الیہ یوم القیامۃ۔

"یہ جو ہمارے مقابلہ میں اس منصب کے متعلق استبداد سے کام لیا گیا حالانکہ ہماری خاندانی خصوصیت بلند درجہ پر تھی اور ہم کو

رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ تعلق تھا' یہ ایک بے انصافی تھی جس میں بعض لوگوں نے بخل سے کام لیا اور دوسری جماعت نے فیاضی صرف کی اور فیصلہ کرنے والا خدا ہے اور آخر میں سب کو اُس کے پاس پہونچنا ہے"۔

"فیاضی" سے عملی طور پر جنگ وجدال اور منازعت سے کام نہ لینا مراد ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکالا جاسکتا کہ اس حق کے دوسروں کے پاس چلے جانے پر رضامندی اختیار کر لی گئی ورنہ اس کے بعد کے فقرہ کا کوئی محل نہیں تھا کہ "فیصلہ کرنے والا خدا ہے اور سب کو اُس کے پاس جانا ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بنائے مخاصمت فریق مخالف سے بارگاہ خداوندی میں دعوی کے لئے موجود ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حق سے درگذر کر کے خوشنودی سے کام نہیں لیا گیا۔

ص۲۴۴ میں ہے۔

قد قال قائل انّک علی ھذا الامر یا ابن ابی طالب لحریص فقلت بل انتم واللہ لاحرص وابعد وانا اخصّ واقرب وانّما طلبت حقّا لی وانتم تحولون بینی وبینہ وتضربون وجھی دونہ۔

"ایک کہنے والے نے کہا کہ تم اے فرزند ابو طالب اس

منصب خلافت کی بہت لالچ رکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ بخدا لالچی تو تم لوگ ہو اور میں تو خصوصیت رکھتا ہوں اور قریب درجہ رکھتا ہوں اور اپنا ایک حق طلب کرتا ہوں جو مجھ سے مخصوص ہے اور تم لوگ مجھے اُس حق تک پہونچنے سے مانع ہوتے ہو اور سد راہ ہوتے ہو"۔

اس کے بعد آپ نے بارگاہ الہی میں حسب ذیل الفاظ میں مناجات کی:۔

اللّھم انی استعدیک علی قریش ومن اعانھم فانّھم قطعوا رحمی وصغّروا عظیم منزلتی واجمعوا علی منازعتی امراً ھولی۔

"بار الہا میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں قریش اور اُن کے مددگاروں کی کہ اُنھوں نے میری قرابت کے لحاظ کو دور کیا اور میری عزّت اور درجہ کو کم کیا اور میرے خلاف ایکا کیا اُس امر کے مجھ سے چھین لینے میں جو مجھ سے مخصوص ہے"۔

ص۲۶۴ میں اس دعا کے یہ الفاظ ہیں۔

اللّھمّ انی استعذیک علی قریش فانّھم قد قطعوا رحمی واکفأوا انائی واجمعوا علی منازعتی حقا کنت اولی بہ من غیری۔

مطلب اس کا بھی وہی ہے صرف لفظوں کا تھوڑا سا فرق ہے۔

جلد دوم صفحہ ۶۳ میں ایک خط کے ذیل میں جو حضرت نے اپنے بھائی عقیل کو لکھا ہے یہ الفاظ ہیں۔

فجزت قریشا عنّی الجوازی فقد قطعوا رحمی وسلبونی سلطان ابن امّی

"خدا قریش سے میرے متعلق اُن کی بدسلوکی کا بدلا لے۔ انھوں نے میری قرابت کے لحاظ کو دور کیا اور میرے بھائی کی حکومت کے منصب کو مجھ سے دور کیا"۔

جلد دوم صفحہ ۱۲۳ میں اُس فرمان کے ذیل میں جو اہل مصر کے نام تحریر فرمایا ہے لکھا ہے۔

ماکان یلقی فی روعی ولا یخطر ببالی ان العرب تزعج ھذا الامر من بعدہ صلی اللہ علیہ و آلہ عن اھل بیتہ ولا انھم منحوہ عنی من بعدہ فما راعنی الا انثیال الناس علی فلان یبایعونہ فامسکت یدی

"مجھے کبھی یہ تصور بھی نہیں ہوتا تھا کہ عرب قوم اس خلافت کے منصب کو آنحضرت م کے بعد آپ کے اہل بیت سے ہٹالے گی اور مخصوص مجھ سے اس کو دور کریگی لیکن ایک مرتبہ یہ صورت نظر آئی کہ لوگ ابوبکر پر ٹوٹ پڑے ہیں اور اُن کی بعیت کر رہے ہیں یہ دیکھ کر میں نے ہاتھ روک لیا"۔

ان عبارتوں سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ حضرت علی پہلے خلفاء کی سلطنت کو جائز اور صحیح نہیں سمجھتے تھے اور خلافت کو اپنا مخصوص حق جانتے تھے اور دوسرے لوگوں کا قبضہ اُس پر غاصبانہ قرار دیتے تھے جس کے فیصلہ کے لئے روز قیامت کے دن کے منتظر تھے۔

اہلبیت رسول کی پیشوائی

حضرت نے کثیر التعداد مواقع پر اہلبیت کے فضائل اور اُن کے خصوصیات کو نہایت نمایاں الفاظ میں پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ دین اور شریعت کا صحیح علم انہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور مسلمانوں کے حقیقی مقتدا وہی بن سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے ارشادات۔

ص ۲۳ آل محمد کے وصف میں ہے۔

موضع سرہ ولجأ امرہ وعیبۃ علمہ وموئل حکمہ وکھوف کتبہ وجبال دینہ بھم اقام انحناء ظھرہ واذھب ارتعاد فرائصہ.

"یہ لوگ رسول اللہ کے اسرار کے حامل اور آپ کی شریعت کی پشت پناہ آپ کے علم کا ظرف اور آپ کی حکمتوں کا مرکز اور آپکی کتاب کے اجزاء کی شیرازہ بندی کرنے والے اور آپ کے دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعہ سے دین میں قوت اور پائداری پیدا ہوئی اور اُس کے جوڑ بند کی تھرتھری دور ہوئی ہے"۔

ص ۲۰۶ میں ہے۔

انظروا اھل بیت نبیکم فالزموا سمتھم واتبعوا اثرھم فلن یخرجوکم من ھدی ولن یعیدوکم فی ردی فان لبدوا فالبدوا

وان نهضوا فانهضوا ولا تسبقوهم فتضلّوا ولا تتأخّروا عنهم فتهلكوا

"اپنے نبی کے اہلبیت کو دیکھو ان کی طرف رہنے کے پابند رہو اور اُن کے نقش قدم پر چلتے رہو۔ یہ تم کو کبھی ہدایت کے دائرہ سے باہر نہیں نکالیں گے، اور ہلاکت میں ڈالیں گے نہیں۔ اگر یہ بیٹھ جائیں تو بیٹھ جاؤ اور یہ اٹھیں تو تم بھی اٹھو ان کے آگے نہ بڑھو کہ گمراہ ہو جاؤ اور نہ اُن کے پیچھے رہو کہ ہلاکت میں مبتلا ہو۔"

اس میں یہ بھی آپ نے واضح فرما دیا ہے کہ اہلبیت کو صرف قرابت کی بنا پر فضیلت نہیں حاصل ہے بلکہ تعلیمات رسول کی حقیقی روح انہی کے پاس ہے۔ اس لئے اُن کی پیروی لازم ہے۔

ص۲۳۳ نحن شجرة النّبوة ومحطّ الرّسالة ومختلف الملائكة ومعادن العلم وينابيع الحكم ناصرنا ومحبّنا ينتظر الرّحمة وعدوّنا ومبغضنا ينتظر السّطوة.

"ہم نبوت کا درخت ہیں اور رسالت کے اُترنے کی جگہ ہیں اور فرشتوں کے آمد ورفت کا محل اور علم کی کان اور حکمت کے سرچشمہ ہیں۔ ہمارے مددگار اور دوست کو رحمت کا امیدوار اور ہمارے دشمن کو عذاب الٰہی کا منتظر رہنا چاہیئے۔"

ص۲۵۰ عندنا اهل البيت ابواب الحكم وضياء بالامر

"ہم اہلبیت کے پاس علم و حکمت کے دروازے ہیں اور دین اور شریعت کی روشنی ہے۔"

ص۲۹۷ نحن الشعار والاصحاب والخزنة والابواب و لا تؤتى البيوت الّا من ابوابها فمن اتاها من غير ابوابها سمّي سارقا.

"ہم رسول سے بالکل متصل اور آپ کے ہر وقت کے ساتھی اور خزانہ دار اور دروازے ہیں اور گھروں میں داخل نہیں ہوا جا سکتا مگر دروازوں سے جو شخص بغیر دروازہ کے کسی دوسرے راستے سے داخل ہو وہ چور ہوگا۔"

اس میں آپ نے اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اگر صحبت ہی سبب شرف اور معیار فوقیت سمجھی جائے تو صحبت رسول کی جیسی اہلبیت کو حاصل ہے ویسی کسی کو بھی نہیں ہے اس لئے اس حیثیت سے بھی خصوصیت اُن کو حاصل ہے اور کسی کو بھی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ آپ کے علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اہلبیت ہیں جس طرح مکان میں داخل ہونے کا ذریعہ اُس کا دروازہ ہوتا ہے۔

ص۲۹۸ میں ہے:۔

فيهم كرائم القرآن وهم كنوز الرّحمٰن ان نطقوا صدقوا و

ان صمتوا لم یسبقوا۔

"آل محمد علیہم السلام ہی وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن کی بزرگ آیتیں نازل ہوئی ہیں اور یہ خدا کی رحمت کے خزانے ہیں اگر یہ بات کرینگے تو سچ ہی بات کرینگے اور جب یہ سکوت کریں تو کسی کو حق نہیں کہ وہ ان پر سبقت کرے۔"

صفحہ ۴۹۵ آل محمد علیہم السلام کے ذکر میں فرماتے ہیں :۔

ہم عیش العلم وموت الجہل یخبرکم حلمہم عن علمہم وصمتہم عن حکم منطقہم لا یخالفون الحق ولا یختلفون فیہ ہم دعائم الاسلام

"یہ علم کی زندگی ہیں اور جہالت کے لیے موت کا سبب ہیں انکی بردباری ان کے علم کی آئینہ بردار اور ان کی خاموشی ان کی حکیمانہ گویائی کی ترجمان ہے وہ حق کی مخالفت نہیں کرتے اور نہ اُس میں اختلاف کرتے ہیں وہ دین کے ستون ہیں۔"

جلد ۲ صفحہ ۳۲ میں آپنے امیر معاویہ کے خط میں یہ وسیع معنی خیز جملہ تحریر فرما دیا ہے کہ :۔

فانا صنائع ربنا والناس بعد صنائع لنا۔

"ہم براہ راست اپنے خدا کے ساختہ و پرداختہ اور احسانمند ہیں اور پھر تمام لوگ اسکے بعد ہمارے ہاتھوں کے ساختہ و پرداختہ اور ممنون احسان ہیں۔"

سقیفہ کی کارروائیوں پر تبصرہ

سقیفہ میں انصار کے مقابلہ میں جس طرح مسئلہ خلافت میں کامیابی حاصل کی گئی ہے اور جن دلائل سے اپنی حقانیت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے خود اُن ہی دلائل سے اُن کے مقابلہ میں حضرت علی بن ابیطالب کی حقیت ثابت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل کے مسلمان خلافت کے لئے جمہوریت و رائے عامہ کے اصول کی تشکیل کریں لیکن جبکہ اُس خلافت کی داغ بیل پڑ رہی تھی تو حضرت ابوبکر و عمر نے اُس کو صرف قرابت کے اصول پر حاصل کیا تھا۔ رسالہ "نگار" لکھنؤ میں جو مسئلہ خلافت و امامت پر آخری مضمون شائع ہوا ہے اور جسے امامیہ مشن کیجانب سے "خلافت و امامت" حصہ چہارم میں شائع کیا گیا ہے اُس میں یہ بحث بہت تفصیل سے موجود ہے۔

امیر المومنین کو جب سقیفہ کے حالات معلوم ہوئے تو آپنے واضح طور سے اس امر پر تبصرہ فرمایا کہ :۔

جو دلائل سقیفہ میں پیش کئے گئے ہیں اُن کا نتیجہ ہماری حقیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۶ حضرت نے دریافت فرمایا کہ قریش نے انصار کے

مقابلہ میں کیا دلیل پیش کی. بیان کیا گیا کہ اُنھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ ہم "شجرۃ الرسول" ہیں یعنی رسول اللہ سے قریبی رشتہ داری رکھتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا:۔

احتجوا بالشجرۃ واضاعوا الثمرۃ

"ان لوگوں نے درخت کو دلیل میں پیش کیا اور اُس کے میوہ کو برباد کیا۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر "شجرۃ الرسول" میں ہونا ان کی حقیت کے لئے کافی ہوسکتا ہے تو آل رسول جو حقیقۃ "شجرۂ رسول" کا ثمرہ ہیں اُن کی حق تلفی کیونکر جائز ہوسکتی ہے۔

جلد دوم صفحہ ۳۴ میں اُس خط کے ذیل میں جو آپ نے معاویہ کو لکھا ہے حسب ذیل واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لما احتج المهاجرون على الانصار يوم السقيفة برسول الله صلى الله عليه وآله فلجوا عليهم فان يكن الفلج به فالحق لنا دونهم وان يكن بغيره فالانصار على دعواهم.

"جب مہاجرین نے انصار کے مقابلہ میں استدلال پیش کیا رسول اللہ کے ساتھ قرابت کی بناء پر تو اُن کے مقابلہ میں کامیاب ہو گئے۔ اگر کامیابی اس دلیل سے ہوسکتی ہے تو حق ہمارا ثابت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا نہیں

اور اگر یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی تو پھر انصار اپنے دعوی پر باقی ہیں ان کو خلافت کے حق سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

خلفاء کے بارے میں آپکے خیالات

گذشتہ بیانات ہی صاف طور سے اس حقیقت کو بے نقاب کردیتے ہیں کہ آپ اُن خلفاء کو جو مسند رسول پر متمکن ہو گئے تھے اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ ان میں سب سے واضح اور صاف خطبہ شقشقیہ ہے جس کے ابتدائی فقرات جو حقیت خلافت سے متعلق ہیں اس کے پہلے درج ہو چکے ہیں۔

آپ نے اس میں دوسری اور تیسری خلافت پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بھی سن لیجئے:۔

ص ۳۵-۴۰

حتى مضى الاول لسبيله فادلى بها الى فلان بعده (ثم تمثل بقول الاعشى)

شتان ما يومي على كورها ويوم حيان اخي جابر

فيا عجبا بينا هو يستقيلها في حياته اذ عقدها لآخر بعد وفاته لشد ما تشطرا ضرعيها فصيرها في حوزة خشناء يغلظ كلامها

ویخشن مسّھا ویکثر العثار فیھا والاعتذار منھا فصاحبھا کراکب الصعبۃ ان اشنق لھا خرم وان اسلس لھا تقحّم فمنی النّاس لعمر اللہ بخبط وشماس وتلوّن واعتراض فصبرت علی طول المدّۃ وشدّۃ المحنۃ حتی اذا مضی لسبیلہ جعلھا فی جماعۃ زعم انی احدھم فیا للہ وللشوریٰ متی اعترض الرّیب فیّ مع الاوّل منھم حتی صرت اقرن الی ھذہ النظائر۔

"جب خلیفۂ اوّل دنیا سے چل بسے تو انھوں نے اس خلافت کو دوسرے آدمی (عمر بن الخطاب) کے سپرد کیا۔ پھر آپنے اعشی کا شعر بطور مثال پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ کہاں وہ زمانہ جب رسول اللہ کے زمانہ میں میری ہر طرح عزت و حرمت تھی اور کہاں یہ دور۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ کہاں تو وہ اپنی زندگی کے دور میں اس خلافت کے منصب سے معافی مانگتے تھے (اشارہ ہے حضرت ابوبکر کے اُس خطبہ کی طرف جس میں آپنے کہا تھا" اقیلونی اقیلونی فلست بخیرکم" مجھے معاف کردو معاف کردو۔ میں تم میں کچھ بہتر نہیں ہوں" اور کہاں اُس خلافت کو اُنھوں نے اپنے انتقال کے بعد دوسرے کے لئے مقرر کردیا۔ کتنی سختی کے ساتھ ان دونوں آدمیوں نے خلافت کے تھنوں کو اپنے درمیان تقسیم کیا۔ خلیفۂ اول نے اُس کو قرار دیدیا ایک سخت

جگہ پر جو سنگلاخ اور درشت ہے اور جس میں ٹھوکریں بہت لگتی ہیں اور عذر کی ضرورت بہت پڑتی ہے۔ جس کو اُس سے سابقہ پڑے وہ اُس ناقہ کے سوار کی طرح ہے جس کی یہ حالت ہے کہ اگر اُس کی مہار زور سے کھینچی جائے تو وہ اپنے نتھنوں کو زخمی کئے دیتا ہو اور اگر ڈھیل دیدے تو وہ جاکر ان کے کھوئے میں گر پڑے۔ پس لوگ مبتلا ہوگئے بخدا ہاتھ پاؤں مارنے میں اور سرکشی میں اور رنگ بدلنے میں اور بے راہ روی میں۔ میں نے اس دور میں بھی باوجود مدت طولانی ہونے کے تحمل سے کام لیا یہاں تک کہ یہ بھی اپنے راستے پر گئے (انتقال ہوا) تو وہ اس خلافت کو کچھ لوگوں کے درمیان قرار دے گئے جن میں سے اُنھوں نے مجھے بھی ایک خیال کیا۔ خدا سمجھے اس شوریٰ کی کمیٹی سے۔ کب شک و شبہہ تھا میری حیثیت میں اُن میں سے پہلے شخص (ابوبکر) کے مقابلہ میں جواب مجھے برابر لایا گیا ایسے اشخاص کے ساتھ"۔

آپ کا اختلاف خلفاء سے اتنا نمایاں امر تھا کہ جو ہر شخص کو معلوم تھا چنانچہ معاویہ نے ایک خط میں اس کو آپکے مقابلہ میں بطور اعتراض پیش کیا اور یہ لکھا کہ آپ نے تمام خلفاء پر حسد کیا اور سب سے بغاوت کی۔ اس کے جواب میں حضرت نے اصل حقیقت سے

کہ آپ کو ان لوگوں سے اختلاف تھا انکار نہیں کیا بلکہ اُس کی اس تعریض کو صرف بے محل اور خلاف موقع بتایا اس بنا پر کہ اُس کا زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔

جلد دوم صفحہ ۳۴۔ امیر المومنین نے جو معاویہ کو جواب لکھا ہے اُس میں تحریر فرمایا ہے:۔

وزعمت انی لکلّ الخلفاء حسدت وعلی کلّھم بغیت فان یکن ذلک کذلک فلیس الجنایۃ علیک فیکون العذر الیک وتلک شکاۃ ظاھر عنک عارھا۔

"تم نے یہ خیال کیا کہ میں نے سب خلفاء پر حسد کیا ہے اور سب کے مقابلہ میں بغاوت سے کام لیا۔ اگر ایسا بھی ہو تو یہ تمہارا کوئی جرم نہیں تھا کہ میں تم سے اس کی معذرت چاہوں۔ یہ ایسی بات ہے جس کے نتیجہ سے تم کو کوئی تعلق ہی نہیں۔"

یہ بھی معاویہ نے لکھا تھا کہ آپ کی حالت اُس زمانہ میں یہ تھی کہ جبریہ طور پر بیعت کے لئے کھینچکر لائے جاتے تھے جس طرح اونٹ کو کھینچ کر لاتے ہیں۔ آپنے اس کے جواب میں بھی اصل حقیقت سے انکار نہیں کیا ہے فرماتے ہیں:۔

"وقلت انی کنت اقاد کما یقاد الجمل المخشوش حتی ابایع

ولعمر اللّٰہ لقد اردت ان تذم فمدحت وان تفضح فافتضحت وما علی المسلم من غضاضۃ فی ان یکون مظلوما ما لم یکن شاکا فی دینہ ولا مرتابا بیقینہ۔

"تم نے کہا ہو کہ میں کھینچا جاتا تھا جس طرح وہ اونٹ کھینچا جاتا ہے جس کے نکیل بندھی ہوئی ہو تاکہ بیعت کروں بخدا تم نے چاہا تھا کہ مذمت کرو لیکن تعریف کر دی اور مجھے رسوا کرو مگر خود تمھاری رسوائی ہوئی۔ ایک مسلمان کے لئے کوئی عیب نہیں اس میں کہ وہ مظلوم ہو جب تک کہ وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقینِ کامل میں متزلزل نہ ہو۔"

ج ۲ صفحہ ۱۸۷ میں آپ کا یہ قول درج ہے کہ:۔

واعجباہ اتکون الخلافۃ بالصحابۃ والقرابۃ

"عجیب کیا خلافت صحبت اور قرابت ہی کی بنیاد پر قائم ہے"؟۔

آپ کا یہ شعر بھی اسی مضمون سے متعلق ہے

فان کنت بالشوری ملکت امورھم — فکیف بھذا والمشیرون غیّب

وان کنت بالقربیٰ حججت خصیمھم — فغیرک اولی بالنبیؐ واقرب

یعنی اگر تم شوریٰ سے مسلمانوں کی حکومت پر متمکن ہوئے ہو تو یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جبکہ شورہ دینے والے موجود ہی نہ تھے اکیونکہ سقیفہ

میں تمام مسلمانوں کی نمایندگی نہ تھی اور اہلبیت رسول میں سے کوئی فرد موجود نہ تھی) اور اگر تم قرابت سے اپنی مخالف جماعت (انصار) پر غالب آئے ہو تو تمہارے سوا دوسرا شخص (یعنی خود حضرت علیؑ) تم سے زیادہ رسول کے ساتھ خصوصیت کا مالک ہے اور قرابت رکھتا ہے۔"

عملی مخالفت نہ کرنیکے وجوہ

حضرت علیؑ نے متعدد مقامات پر وہ اسباب بھی ظاہر کئے ہیں جن کی بنا پر آپنے خلفاء سے عملی طور پر مقابلہ نہیں کیا اور جنگ کی صورت نہیں آنے دی۔ ان میں سے بعض اسباب ظاہری ہیں اور بعض واقعی جو محل اور موقع کی مناسبت سے آپنے بیان فرمائے ہیں۔

پہلا سبب اور حقیقۃً یہی سب سے بڑا سبب تھا جو امیر المومنین کے لئے تلوار اٹھانے سے مانع تھا۔

وہ مفاد اسلامی کا خیال کہ موجودہ حالت میں جبکہ مسلمان ابھی پورے طور پر اسلام میں راسخ نہیں ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ مرتد ہونے کے لئے تیار ہیں اگر کوئی ہنگامہ برپا ہو جائے اور مسلمانوں میں جنگ قائم ہو جائے تو اسلام کو بہت بڑا نقصان پہونچے گا اور یہ ظاہری اسلام کی شان بھی جو دنیا میں قائم ہے رخصت ہو جائیگی۔

اس مقصد کے لئے آپنے نہ صرف جنگ سے پہلوتہی کی بلکہ اکثر مذہبی خدمتوں کے لئے دست تعاون بھی بڑھایا اور بوقت ضرورت حکومت وقت کی امداد بھی کی۔

اسکو آپنے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

ج ۲ ص ۱۲۳ فما راعنی الّا انثیال النّاس علی فلان یبایعونہ فامسکت یدی حتّی رأیت راجعۃ النّاس قد رجعت عن الاسلام یدعون الی محق دین محمّد صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ فخشیت ان لم انصر الاسلام واھلہ ان اری فیہ ثلما او ھدما تکون المصیبۃ بہ علیّ اعظم من فوت ولایتکم الّتی انّما ھی متاع ایّام قلائل یزول منھا ما کان کما یزول السّراب او کما یتقشّع السّحاب فنھضت فی تلک الاحداث حتّیٰ زاح الباطل وزھق واطمأنّ الدّین وتنھنہ۔

"ایک مرتبہ نظر آیا مجھے یہ کہ لوگ فلاں شخص (ابوبکر) پر بیعت کے لئے ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا یہانتک کہ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ دین اسلام سے پلٹ گئے ہیں اور اس دین کے مٹا دینے کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ اُس وقت مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر میں اسلام اور مسلمانوں کی نصرت نہ کروں تو

مجھے دین اسلام میں رخنہ یا بربادی کا منظر دکھائی دے جس کی مصیبت
میرے اوپر زیادہ سخت ہوگی تمھاری اس حکومت کے ہاتھ سے نکل جانے
سے جو چند دنوں کی ایک بات ہے اور پھر اس طرح ختم ہو جانیوالی
ہے جس طرح شراب کا تخیل ختم ہو جاتا ہے یا ابر چھٹ جاتا ہے پس میں
اٹھ کھڑا ہوا ان حوادث میں یہاں تک کہ باطل کا زور و شور ختم ہوا
اور وہ فنا ہوا اور دین کو قرار حاصل ہوا اور سکون پیدا ہوا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین کے سامنے دو سوال تھے
ایک مفاد اسلامی اور ایک اپنے حق کا حاصل کرنا۔ آپ نے مفادِ
اسلامی کی خاطر اپنے حق کے حاصل کرنے میں عملی جد و جہد نہیں کی
اور شمشیر زنی اور لشکر آرائی سے کام نہیں لیا۔

دوسرا سبب یہ ظاہری پہلو ہے جسے آپ سطحی نگاہ رکھنے والوں کے سامنے
بیان فرمادیا کرتے تھے، وہ انصار و اعوان کی عدم موجودگی
ہے۔ یہ عام لوگوں کی افتادِ طبع ہے کہ اگر انہیں کامیابی حاصل کرنے کے
اسباب نہیں ہیں تب بھی وہ فریق مخالف کو پریشان کرنے کے لئے
اور چین سے نہ بیٹھنے دینے کے لئے کچھ نہ کچھ دراندازی کرتے
رہتے ہیں۔ امیر المومنینؑ کی بلند ہستی اس کو ناپسند کرتی تھی۔ آپ نے
عباس اور ابوسفیان سے اُس وقت جب انھوں نے کہا ہے کہ ہم

آپ کی خلافت کے لئے بیعت کئے لیتے ہیں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے
اُس میں یہ بھی ہے کہ افلح من نہض بجناح او استسلم فاراح
(ج ا ص ٤٥)

(یعنی) انسان اُٹھے تو بال و پر کے ساتھ اُٹھے، اور نہیں تو پھر
خاموش رہے اور دنیا کو چین سے بیٹھنے دے۔"

یہ طریقہ کہ کامیاب تو نہیں ہونگے لیکن فضا میں بے چینی پیدا کئے
رہیں گے اور فریق مقابل کو چین سے بھی بیٹھنے نہیں دینگے۔ بالکل
عقل و تدبر کے خلاف ہے

خطبہ شقشقیہ میں بھی آپ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

ص ٣٥ ۔ و طفقت ارتائی بین ان اصول بید جذاء او اصبر
علی طخیۃ عمیاء یہرم فیہا الکبیر ویشیب فیہا الصغیر ویکدح فیہا
مؤمن حتی یلقی ربہ فرأیت ان الصبر علی ھاتا احجی۔

"میں نے غور کیا کہ میں اس کٹے ہوئے دست و بازو کے ساتھ
(یعنی بغیر انصار و اعوان کے) حملہ کردوں یا اس گھنگھور مصیبت کی
گھٹا پہ صبر کروں جس کی بیر سن آدمی بالکل پھوس بنجاتا ہے اور کمسن آدمی بھی بوڑھا ہو جاتا ہے
اور مومن اس میں مبتلائے مصیبت رہتا ہے یہاں تک کہ اس دنیا
کو خیر باد کہے۔ میں نے دیکھا کہ صبر کرنا اس مصیبت پر زیادہ مطابق عقل ہ

صلا۴ میں ہے

فنظرت فاذا لیس لی معین الا اهل بیتی فضننت بهم عن الموت واغضیت علی القذیٰ وشربت علی الشجی وصبرت علی اخذ الکظم وعلی امر من طعم العلقم۔

"میں نے نظر ڈالی تو دیکھا کہ میرا مددگار نہیں ہے سوائے میرے گھرانے والوں کے۔ میں نے ان کو موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا اور چشم پوشی کی باوجود اُس خاشاک کے جو آنکھ میں پڑا ہوا تھا اور پانی پیا باوجود اُس ہڈی کے جو گلے میں پھنسی تھی اور تحمل کیا گلا گھٹنے پر اور تلخ ترین صورت حال پر۔"

یہ کہنا کہ بعقیدۂ شیعہ امیر المومنین کو اعجاز کی طاقت تھی اور اس لئے تنہا مقابلہ کر سکتے تھے درست نہیں ہے اس بنا پر کہ شریعت اسلام کے احکام کی بنیاد ظاہری اسباب پر ہے ورنہ رسول اللہ کو ہجرت کی ضرورت نہ ہوتی اور انصار کی امداد حاصل کرنے کی حاجت نہ ہوتی

تیسرا سبب رسول اللہؐ کی وصیت، یعنی حضرتؐ نے امیر المومنینؑ کو آیندہ کے واقعات سے اطلاع دیتے ہوئے۔ یہ ہدایت کردی تھی کہ جنگ اور مقابلہ کی صورت پیدا نہ ہو، اسے آپ نے ایک موقع پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ج اصفحہ ۹۸ اترانی اکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ واللہ لانا اوّل من صدّقہ فلا اکون اوّل من کذب علیہ فنظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ کی جانب کوئی بات غلط طور پر منسوب کرونگا بخدا میں نے سب سے پہلے حضرت کی تصدیق کی ہے تو میں پہلا شخص نہیں ہونگا جو آپ کی طرف غلط نسبتیں دے۔ میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو اطاعت رسول میری بیعت سے پہلے موجود ہے اور عہد و پیمان کا حلقہ میرے گلے میں ایک دوسرے شخص (رسول) کی جانب سے پڑا ہوا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ میرے بیعت نہ کرنے کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ میں مقابلہ کروں کیونکہ بیعت میں کروں یا نہ کروں اس کے پہلے تو رسول اللہ کی وصیت مجھ کو ہو چکی ہے اور مجھ پر اُس کی پابندی لازم ہے۔

درحقیقت یہ تینوں باتیں جو درج ہوئیں باہم دست و گریبان ہیں، اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر امیر المومنینؑ کے انصار و اعوان آپ کی حقیت کے بارے میں عرب میں زیادہ تعداد میں موجود ہوتے اور آپ کی مخالف ایک بہت کمزور اور کم تعداد جماعت

ہوتی تو آپ کے بزورِ شمشیر مسندِ خلافت پر متمکن ہونے سے اسلام کو کوئی خاص نقصان بھی نہ پہونچتا اور اس صورت میں رسول اللہؐ کی طرف سے یہ وصیت بھی نہ ہوتی کہ مقابلہ نہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ آپ کے خلاف ایک عام سازش کی جا چکی تھی اور بہت بڑی تعداد اشخاص کی آپ کے خلاف متحد بنائی گئی تھی اس لئے اگر آپ تلوار کھینچتے تو اسلام کی ظاہری صورت کو بہت بڑا نقصان پہونچتا اور اسی لئے رسول اللہؐ نے بھی یہ وصیت کی اور امیر المومنینؑ نے بھی اُس کا لحاظ کیا۔

کم علم لوگ جذبات کے ماتحت کام کرتے ہیں لیکن امیر المومنینؑ اُن تمام اسرار اور باطنی سازشوں سے مطلع تھے جو آپ کے خلاف کی جا چکی تھیں۔ اس لئے آپ کبھی ایسے بے سمجھے بوجھے ہوئے اقدام پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔

یہی آپ نے عباس اور ابو سفیان سے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

ج اص۴۶ بل اند مجت علی مکنون علم لو بحت بہ لا ضطربتم اضطراب الارشیۃ فی الطوی البعیدۃ۔

"مجھ کو وہ مخفی علم حاصل ہے کہ اگر میں اُس کا اظہار کر دوں تو تم لوگ مضطرب ہو جاؤ اُس طرح جیسے رسیاں مضطرب ہوتی ہیں بڑے گہرے کنووں کے اندر"۔

اس کے یہ معنی قرار دینا کہ آپ خلفائے وقت کی حقیقت کو جانتے تھے اور یہ کہ وہ مجھ سے زیادہ اس منصب کے اہل ہیں بالکل غلط ہے جبکہ آپ نے صاف صاف یہ تصریحات فرما دئے ہیں کہ وہ لوگ خلافت کے مستحق نہیں ہیں اور اس منصب کا استحقاق صرف آپ کی ذات کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں ہے۔

وصیت کے مسئلہ پر یہ اعتراض کہ پھر آپ نے جمل اور صفین اور نہروان میں کیوں تلوار اٹھائی ہرگز صحیح نہیں ہے۔ وصیت جس موقع سے متعلق تھی وہ دوسرا تھا اور تلوار جس موقع پر اُٹھائی وہ دوسرا۔

عجیب کارروائی

وہ لوگ جنھیں کسی وجہ سے اس کی ضرورت ہے کہ حضرت علیؑ کو خلفائے ثلٰثہ کے ساتھ متفق ثابت کریں اُن کی جانب سے عجیب طرح کی کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ کبھی تو اہلسنت کی کتابوں سے ایسی روایتیں درج کی جاتی ہیں جنھیں خاص اِسی مقصد کے لئے تصنیف کیا گیا ہے اور جن کو شیعہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے ہیں کہ ہمارے دلائل محض الزامی نہیں۔ بلکہ تحقیقی ہیں، حالانکہ یہ اصول تحقیق کے بھی بالکل خلاف ہے۔ ایک

اختلافی مسئلہ میں جتنا وزن مخالف اشخاص کے بیانات کو ہو سکتا ہے اتنا موافق افراد کے بیانات کو کبھی نہیں ہو سکتا۔ جبکہ تاریخ بتلاتی بھی ہے کہ اموی سلطنت کے عہد جبروت میں ہزاروں روایتیں اس طرح کی بن گئیں جن کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ان افراد کے بحث کا یہ وہ کمزور پہلو ہے جس کا احساس اکثر غیر جانبدار محققین کو بھی ہوا ہے چنانچہ مسئلہ خلافت و امامت میں رسالہ "نگار" میں جو مضامین ہر نام اور خود نیاز فتحپوری کے شائع ہوئے ہیں اُن میں اس کمزوری پر اعتراض موجود ہے۔

اس کے بعد جب نوبت آتی ہے شیعی کتب سے ثبوت پیش کرنے کی تو صحرائے استدلال بے آب و گیاہ نظر آتا ہے۔ اُس وقت کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور اس طرح اپنی پیاس کو بجھایا جاتا ہے کبھی تو امیر المومنینؑ کے اُن بیانات کو جو خلافت بمعنی سلطنت و حکومت سے متعلق ہیں لا کر چسپاں کیا جاتا ہے اُس امامت پر جو جانشینیٔ رسول کا حقیقی منصب ہے، اور جناب امیرؑ کے اُن بیانات سے بالکل چشم پوشی کی جاتی ہے جو اس امامت کے متعلق صاف موجود ہیں نیز اُن بیانات سے جن میں پہلی قسم کی خلافت کو بھی اپنا حق بتلایا گیا ہے یہ وہ چیزیں ہیں جو توضیح سے اس کے پہلے آچکی ہیں۔

اور کبھی الفاظ میں تحریف کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ایک خطبہ پیش کیا جاتا ہے جو نہج البلاغہ میں مذکور نہیں ہے بلکہ بعض شارحین نہج البلاغہ نے شرح میں درج کیا ہے۔ اُس سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے کہ:۔

وکان افضلهم فی الاسلام وانصحهم للّٰه ورسوله الخلیفة الصدیق وخلیفة الخلیفة الفاروق ولعمری ان مکانهما فی الاسلام لعظیم و ان المصاب بهما لجرح فی الاسلام شدید یرحمهما اللّٰه وجزاهما باحسن ما عملا۔

"سب سے افضل اسلام میں اور سب سے زیادہ خیر خواہ خدا و رسول کے خلیفۂ رسول صدیق اور اُن کے خلیفہ فاروق تھے اور قسم اپنی جان کی کہ جگہ اُن کی اسلام میں بہت بڑی تھی اور مصیبت ان دونوں کے سبب سے اسلام میں شدید تھی خدا اپنی رحمت اُن کے شامل حال کرے اور اُن کو بدلا دے اُن کے بہترین عمل کا۔"

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی امیر المومنینؑ ان دونوں بزرگواروں کی تعریف کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہونے سے تعجب ہوگا کہ اس میں شروع کے جملہ میں ایک لفظ موجود تھی جس کو حذف کر کے اس تعریف کی عمارت کو بلند کیا گیا ہے

پہلا فقرہ اس عبارت کا اصل میں یوں ہے:-

وکان افضلھم فی الاسلام وانصحھم للہ ورسولہ کما زعمت الخلیفۃ الصدیق الخ۔

(یعنی) سب سے افضل اسلام میں اور خیرخواہ خدا و رسول ۔ جیسا کہ تمہارا خیال ہے خلیفۂ صدیق تھے الخ

اب آپ نے دیکھا کہ یہ مخاطب کا خیال ذکر کیا جا رہا ہے نہ اپنا عقیدہ پھر اس کے لئے "زعم" کی لفظ صرف کی گئی ہے جس کے لئے ارباب لغت سے یہ بھی سن لیجئے کہ "عرب کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص کچھ کہتا ہے اور وہ اُن کے نزدیک غلط ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں "زعم فلان" یعنی یہ گمان باطل اُس نے قائم کیا ہے" (منجد صـ۳۰۶)

کیا اس طرح کی تحریف سے جو نتیجہ نکالا جائے اُس میں کوئی شائبہ حقانیت کا ہو سکتا ہے؟

اور سنئے نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ج ۲ صـ۲۵۳ میں حضرت علی مرتضیٰ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ منقول ہیں:-

"ووليهم وال فاقام واستقام حتى ضرب الدين بجرانه"

"خلق خدا کے اصلاح و انتظام کا ذمہ دار ہوا ایک حاکم و فرمانروا جو راہ راست پر قائم رہا اور دنیا کو اُس نے سیدھے راستے پر لگایا یہاں تک کہ

دین خدا نے اپنا سینہ زمیں پر ٹیک دیا"۔

اس کی شرح میں مفتی دیار مصریہ علامہ محمد عبدہ تو یہ لکھتے ہیں کہ:-

"الوالی یرید بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ولیھم ای تولی امورھم وسیاسۃ الشریعۃ فیہم"

(یعنی) "والی" سے مراد حضرت رسول اللہ ؐ ہیں اور والی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ مسلمانوں کے اصلاح و تربیت اور شرعی سیاست کے ذمہ دار تھے"۔

انھوں نے اس خیال کو کہ اس سے حضرت عمر مراد ہیں انتہائی کمزور طریقہ سے "قال قائل" کے لفظ سے نقل کیا ہے۔ یعنی ایک کہنے والے نے یہ کہا ہے"۔ مگر یہاں کے لوگ ہیں کہ وہ اس کمزور قول کو وحی آسمانی بنانے کے خواہشمند ہیں۔

فارس اور روم کے غزوات کے سلسلہ میں امیرالمومنین کے مشورے

یہ چیز ہے جس پر زور دیا جاتا ہے کہ امیرالمومنین کو خلفائے ثلٰثہ اور بالخصوص حضرت عمر کے ساتھ اتنا اتحاد تھا کہ آپ نے اُن کو بہت مفید مشورے دئے ہیں۔

اس کے متعلق عرصہ ہوا کہ اخبار "الواعظ" لکھنؤ میں میرا ایک مضمون

شائع ہوا تھا جو "اتحاد الفریقین" حصہ دوم میں امامیہ مشن کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ چونکہ اُس مضمون کو اس کتاب کے موضوع سے تعلق ہے اور یہی اُس کا موقع ہے۔ اس لئے اُس مضمون کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔ آیندہ اڈیشن میں اتحاد الفریقین سے اُس کو نکال دیا جائیگا۔

سیرتِ علوی کا ایک ورق

دنیا میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو ذاتی مفاد کے مقابلہ میں نوعی مفاد کو پامال کر دیں لیکن ایسے افراد بہت کم ہیں جو اجتماعی مفاد کی خاطر اپنے شخصی و ذاتی مقاصد و اغراض پر پانی پھرنا گوارا کریں۔

انسان کی عام ذہنیت اُس کو اغراض شخصیہ کی چار دیواری میں محدود رکھتی ہے اور اُس کی افتادِ طبع یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دنیا کی کسی چیز کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرے اور پھر تنگ نظری یہ ہے کہ وہ دوسرے انسان کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کر کے اُسکے طرزِ عمل کو اپنے زاویۂ نظر اور معیارِ ذہنیت سے جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس طرح نتائج کے نکالنے میں وہ ٹھوکریں کھاتا ہے اور غلطیاں

کرتا ہے جس کی ذمہ دار اُس کی پست ذہنیت ہے اور کچھ نہیں۔

حالانکہ عقل و تدبر کا اقتضا یہ ہے کہ بلند افراد کے طرزِ عمل کو انکی شایانِ شان بلند ذہنیت کے مطابق اور پست افراد کے طرزِ عمل کو اُن کے مطابق نقطۂ نظر سے جانچا جائے لیکن عام طور سے ایسا نہیں ہوتا۔

انسان کی بلندترین صفت یہ ہے کہ جب مفادِ شخصی اور مفادِ نوعی و اجتماعی میں تصادم ہو تو مفادِ نوعی کو مقدم رکھا جائے۔ انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناسی کو ہر مقام پر مقدم رکھے اگرچہ وہ اُس کے کسی نفسانی جذبہ کے خلاف ہو۔

انسان کی بلند صفت یہ ہے کہ وہ امانت و دیانت کو ہر موقع پر ملحوظ رکھے چاہے وہ اپنے دشمن کے ساتھ ہو۔

ہر امر میں ذاتیات کا مدنظر ہونا اور اپنی نفسانی محبت یا عداوت کو ہر بات میں دخل دینا یہ تو پست فطرت اور پست طبیعت افراد کا کام ہے جن میں حیوانیت کا عنصر انسانیت سے زیادہ کارفرما ہوتا ہے اگرچہ انسان کی اکثریت ہمیشہ اسی مسلک پر قدمزن ہے لیکن اکثریت کو اگر معیارِ صداقت قرار دے لیا جائے تو ہر بداخلاقی، پست فطرتی اور مفسدہ پردازی تہذیب و تمدن اور کمال و شرافت اور ہر کمال و شرف، علم و ہنر انسان کے لئے نقص و عیب بن جانا ضروری ہے۔

لیکن یہ افسوس ہے کہ دنیا بلند افراد کے طرز عمل کو ہمیشہ اپنی ذہنیت کے تحت میں دیکھتی ہے اور اُس سے نتیجہ غلط نکالتی ہے

حضرت امیر المومنینؑ علی ابن ابیطالبؑ کی ذات دنیائے اسلام میں اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ اور انسانی اوصاف و کمالات کا بہترین مجسمہ تھی۔

حضرت کی سیرت اُن تمام خصوصیات سے مملو ہے جو ایک انسان کی کامل انسانیت کے جوہر سمجھے جا سکتے ہیں اس لئے حضرت کی سیرت میں یہ پہلو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے کہ حضرت نے کبھی اسلامی و اجتماعی معاملات میں اپنی ذاتی مخالفت اور نفسانیت۔ دشمنی و عداوت کو دخل نہیں دیا اور نہ امانت و دیانت کے خیال کو ذاتی اغراض و مقاصد اور خیالات و جذبات پر مقدم کیا۔

دنیا کہ جو خود اپنے اور اپنے مزعومہ پیشواؤں کے طرز عمل کی بناء پر اس بات کی عادی ہو گئی ہے کہ وہ ہر بات میں شخصی اغراض کا پہلو مدنظر رکھے حضرت کے اس طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ حضرت کو کوئی ذاتی اختلاف کسی سے تھا ہی نہیں اور آپ انتہائی ربط و محبت اور دوستی و مودت رکھتے تھے حالانکہ اگر تھوڑی سی بلند نظری کو صرف کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ ذاتی اختلاف کے ساتھ مصالح عامہ

کی طرف صحیح رہنمائی کرنا وہ صفت ہے کہ جو انسانی اوصاف کا جوہر امتیاز ہے اور وہی امیر المومنین کے طرز عمل میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

یہ وہ خصوصیت ہے کہ جس سے امیر المومنینؑ کے واقعات زندگی میں تاریخ کے ورق مملو ہیں اور جن کی صورتیں مختلف ہیں۔

کارفرمایان سلطنت یعنی وہ کہ جنھوں نے امیر المومنینؑ کے تمام اوصاف و کمالات اور استحقاق و اختصاص سے چشم پوشی کر کے خلافت کے تخت کو حاصل کیا اور ملت اسلامیہ کے تاجدار اور صاحب اقتدار بنکر اصلاح قوم و ملت کے واحد دعوے دار ہوئے۔ اُنھوں نے مشکلات کے موقع پر آپ سے مشورے لئے اور آپ نے وہ مشورے دئے جو مفاد اسلامی کے لئے حقیقۃً صحیح اور مناسب وقت تھے اور جن کے خلاف ہونا مفاد اسلامی کے لئے انتہائی مضرت رساں تھا۔

ملاحظہ ہو پہلا مشورہ غزوہ روم کے متعلق جو نہج البلاغہ میں مذکور ہے۔ جب حضرت عمر نے جنگ روم میں خود اپنے جانے کے متعلق حضرت سے مشورہ کیا حضرت نے فرمایا:-

قد توکل اللہ لاھل ھذا الدین باعزاز الحوزۃ وستر العورۃ والذی نصرھم وھم قلیل لا ینتصرون ومنعھم وھم قلیل لا یمتنعون حی لا یموت انک متی تسر الی ھذا العدو بنفسک فتلقھم فتنکب

لا تکن للمسلمین کانفة دون اقصی بلادهم فلیس بعدک مرجع یرجعون الیه فابعث الیهم رجلاً مجرّباً واحفز معه اهل البلاء والنصیحة فان اظهر الله فذاک ما تحبّ وان تکن الاخری کنت ردءً للنّاس ومثابة للمسلمین۔

"خداوند عالم نے اس دین کے متعلق یہ ذمّہ داری لی ہے کہ اُسکے مرکز کی تقویت ہو اور رمز دریوں کی پردہ پوشی ہو اور اُس نے انکی مدد کی جب وہ کم تھے کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور اُن کی حفاظت کی جب وہ کم تھے خود اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے' وہ اب بھی موجود ہے زندہ ہے اور مرنے والا نہیں۔ اگر آپ خود دشمنوں کے مقابلہ کو گئے اور جنگ ہوئی اور آپنے شکست کھائی تو مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ اُن دشمنوں کی سرحد کے قریب ہوگی اس لئے کہ آپکے شکست کھانے کے بعد وہاں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں لہذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک تجربہ کار شخص کو روانہ کیجئے اور اُس کے ساتھ بھیجئے اُن اشخاص کو جو سختیاں جنگ کی اُٹھانے کی طاقت اور صداقت واخلاص رکھتے ہوں اس صورت میں اگر خداوند عالم نے غلبہ عطا کیا تو یہی آپ کا مقصد ہے اور اگر معاملہ برعکس ہوا تو آپ یہاں موجود ہی ہیں جنکے پاس مسلمان واپس آئینگے اور پناہ لینگے"۔

کتنے افسوس کا امر ہے کہ اس مشورہ سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حضرت علیؑ اپنے زمانہ کے بادشاہ سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔ اور اُن کی جان کو عزیز سمجھتے تھے جب ہی حضرتؑ نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ آپ جائیں اور شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان بے سرپرست رہ جائیں گے اور کوئی اُنکا والی و وارث نہ ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال حقیقت حال اور مشورہ کے الفاظ سے بہت دور ہے۔

اس امر پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت علیؑ نے مشورہ کے موقع پر خلیفہ وقت کو جنگ کے لئے خود جانے سے کیوں منع کیا؟

کیا حضرت علی کی سیاسی رائے یہی تھی کہ جو بادشاہ وقت اور خلیفہ زمانہ ہو اُس کو کبھی جنگ میں خود جاکر شریک نہ ہونا چاہئے بلکہ خود اپنی جگہ پر بیٹھ کر افواج کو بھیجنا اور دور ہی دور سے اُن کو لڑانا چاہئے؟

ایسا تو نہیں ہے ورنہ خود حضرت جبکہ ظاہری طور پر سلطنت و بادشاہت کے مالک ہوئے تو اس پر عمل کرتے اور خود مدینہ میں بیٹھ کر افواج کو روانہ کرتے یا کم از کم میدان جنگ کے قریب ہی لیکن معرکہ جنگ سے دور کوئی اپنا مرکز قائم کرتے اور خود جنگ میں شریک ہوتے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی لڑائیاں آپکے زمانہ میں ہوئیں سب میں آپ میدان جنگ میں موجود بلکہ تمام سپاہیوں کے آگے تلوار کھینچے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے اندر

شمشیر زنی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لہذا یہ خیال تو صحیح نہیں ہے کہ حضرت کی رائے خلیفہ اسلام کے متعلق یہی تھی کہ اُسکو اپنا مرکز نہ چھوڑنا چاہیے اور خود جنگ میں جاکر شریک نہ ہو۔

پھر کیا یہ تھا کہ حضرت کو خلیفۂ وقت سے محبّت اتنی تھی کہ وہ انکے میدان جنگ میں جانے کے روادار نہ تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ شہید نہ ہو جائیں تو پھر مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔

یہ خیال بھی افسوس ہے کہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضرت امیر کو خلیفۂ وقت سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو، لیکن اُس محبت کے مثل نہیں ہوسکتی جو آپ کو اپنے بھائی مشفق استاد اور معلّم روحانی حضرت رسول اکرم کے ساتھ تھی حالانکہ تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ بڑی بڑی لڑائیوں میں ہمیشہ رسالتمآب میدان جنگ میں موجود ہوتے تھے۔ اور کبھی حضرت علی نے حضرت کو یہ مشورہ نہ دیا کہ حضور کا جنگ میں تشریف لیجانا مناسب نہیں اور حضور مدینہ ہی میں تشریف رکھیں اور لشکر روانہ فرمائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور شہید ہو جائیں پھر مسلمانوں کا کوئی والی و وارث نہ ہوگا باوجودیکہ جنگ احد میں رسالتمآب کو اتنے زخم آگئے تھے کہ حضرت کی زندگی معرض خطر میں نظر آرہی تھی اور بہت قریب تھا کہ حضرت شہید ہو جائیں لیکن اس کے بعد بھی جنگ خندق میں حضرت خود میدان جنگ میں موجود تھے اور حضرت علی

یا کسی صحابی نے بھی حضرت کو مدینہ ہی میں قیام فرمانے کا مشورہ نہیں دیا۔

حضرت علی جتنا بھی خلیفۂ وقت کو دوست رکھتے لیکن اپنے فرزند دلبند فرزندان رسول یعنی حسنین علیہما السلام سے زیادہ دوست نہ رکھتے تھے

حالانکہ صفین و جمل و نہروان کی لڑائیوں میں یہ دونوں صاحبزادے اپنے پدر بزرگوار کے پہلو بہ پہلو جنگ میں شریک تھے اور حضرت نے کسی موقع پر بھی ان کو جنگ سے علٰحدہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیا ان تمام واقعات کی موجودگی میں یہ دل کو لگتی ہوئی بات ہے کہ حضرت علیؑ نے صرف محبت کی وجہ سے حضرت عمر کو جنگ میں جانے سے روکا۔ اور پھر محبّت کی بناء پر جو بات ہو وہ حقیقتاً مشورہ نہیں ہوا کرتا، اسے حضرت عمر کو ماننے کی کیا ضرورت تھی اور اگر حقیقتاً وہ جنگ میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے تو حضرت علی کے صرف اس محبتانہ روکنے سے وہ رک کیوں گئے اور جنگ میں جانے کا خیال ترک کیوں کیا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حقیقت حال کچھ اور ہے اور حضرت علیؑ کا مشورہ کسی اور اندیشہ پر مبنی ہے جس کو حضرت نے اپنے الفاظ میں ظاہر بھی فرما دیا ہے لیکن عام افراد کی حضرت خلیفۂ ثانی کے ساتھ خوش اعتقادی اور جذبۂ اخلاص و محبت نے اس پر غور کرنے کا موقع نہیں دیا اور انھوں نے اس کو دوسرا لباس پہنا دیا۔

حضرت علی کے یہ الفاظ خاص طور سے توجہ کے قابل ہیں انکؑ
متیٰ تسیر الیٰ ھذا العدو بنفسک فتلقھم فتنکب لا تکن للمسلمین کانفۃ
دون اقصی بلادھم فلیس بعدک مرجع یرجعون الیہ۔ اس کا
ترجمہ جو کیا جاتا ہے اور ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے "بتحقیق جس وقت آپ
اس دشمن کے سامنے خود جائیں گے اور خود اُن سے مقابلہ کرینگے تو اگر
کہیں شہید ہو گئے تو پھر مسلمانوں کو کوئی جائے پناہ اُن کے آخری شہروں
تک کہیں نہ ملے گی کیونکہ آپکے بعد کوئی ایسا شخص نہیں جس کی طرف
مسلمان رجوع کریں۔"

افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ان اشخاص کے ذاتی مقصد و خواہش کے
کتنا ہی مطابق ہو لیکن ان الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو اصل
مشورہ کے اندر موجود ہیں۔

"تنکب" کی لفظ کے معنی "شہید ہو گئے" کم سے کم موجودہ عربی لغت
کی کتابوں میں تو نایاب ہیں۔ بلکہ "نکب" کے معنی ہیں "عدل" یعنی
اپنی جگہ سے ہٹنا اور منحرف ہونا اور یا "کسر" یعنی شکست کھانا۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے اس اندیشہ کا اظہار
نہیں کیا ہے کہ آپ شہید ہو جائیں گے بلکہ یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ
کہیں آپ کو میدان جنگ سے ہٹنے کی ضرورت نہ ہو اور شکست اٹھانا نہ پڑے

حقیقت یہ ہے کہ رسالتمآب کے ساتھ کی امتحانی لڑائیوں نے تمام
افراد مہاجرین اور بالخصوص ممتاز ہستیوں کے ثبات و استقلال اور
بلند حوصلگی و پُرجگری کی پوری آزمائش کر لی تھی اور کوئی پردہ
باقی نہ رہ چکا تھا۔

احد و احزاب خیبر و حنین کے تلخ تجربے حضرت علی کے پیش نظر
تھے اور وہ مرقع سامنے تھا کہ جب میدان جنگ کی سنسان فضا اپنی
تنہائی کے سناٹے کے ساتھ ان پُرجگر اور جاں نثار صحابیان رسول کو
دعوت دے رہی تھی اور یہ مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

خیبر کی یادگار سپہ سالاری اور افسری فوج بھی سامنے تھی جس میں
تمام فوج کے متفقہ آواز کی بنا پر شکست کی پوری ذمہ داری سالار
کی بے ثباتی کے اوپر تھی اور حقیقت یہ ہے کہ سالار فوج کی کمزوری
و بے ثباتی کے بعد ناممکن ہے کہ فوج کے قدم ٹھہریں اور وہ کوئی
کامیابی حاصل کر سکے۔

رسالتمآبؐ کے زمانہ میں جو لڑائیاں پیش آ چکی تھیں اور جن میں
ہمیشہ فتح کا سہرا اسلام کے سر رہا اور زبردست سے زبردست بہادر
لشکر مخالف کے زیر تیغ ہوئے اُنھوں نے اسلام کا رعب و دبدبہ قائم
کر دیا تھا اور رسالتمآبؐ کی اُن پیشین گوئیوں نے کہ میری امت کسریٰ و

دقیصر کے ممالک پہ قابض ہوگی سلطنت کے بھو کے عربوں میں ایک خاص
جوش و ولولہ کی روح پھونک دی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دشمن کے
سامنے اپنی جان سے ہاتھ دھو کر جاتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ فتح ہوتی
تھی اور اسلام کی فاتحانہ طاقت کی ہیبت دلوں پہ بڑھتی جاتی تھی اور
یہ ہیبت خود ایک مستقل سبب ہوا کرتی ہے افواج مخالف کی ہزیمت کا
ان فتوحات یا افواج اسلامی کے غلبہ کا فلسفہ کتنا ہی عمیق کیوں
نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حضرت عمر کے ساتھ اتنا ہی تعلق
رکھتا ہے کہ وہ افواج آپ کے روانہ کئے ہوئے اور آپ کی جانب
سے بھیجے ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل کے سلاطین
جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے علیحدہ رہ کر عام مخلوق کو قربانی کے
لئے آگے بڑھاتے اور اُن کو پروانہ صفت اپنے شمع مقصد کی
نذر کرنے اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو کٹوا کر فاتح کا لقب
خود اپنے لئے حاصل کرتے ہیں وہی صورت اس زمانہ کی لڑائیوں
کی تھی۔ جنگ کے خطرناک مصائب، تلواروں نیزوں کا مقابلہ،
موت کے منہ میں جانا یہ سب تمام مسلمانوں کا کام تھا اور حقیقی فتح
کا سہرا انھیں کے سر۔
حضرت عمر ان معاملات میں خود انتہائی درجہ محتاط تھے اور ایسے

خطرناک موقعوں پر آگے بڑھنا اور مہالک میں اپنے تئیں ڈالنا پسند
نہ کرتے تھے وہ میدان جنگ کی سختیوں سے واقف تھے اور خود
اپنی ذاتی حالت اور دل کی طاقت سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مطلع
لیکن یہ واقعہ ہے کہ اکثر اوقات دوسرے اشخاص کے مبالغہ آمیز
بیانات انسان کے احساسات وتخیلات پر ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ
خود اپنے متعلق دھوکا کھا جاتا ہے۔
خوشامدیوں سے دنیا خالی نہیں اور خوش اعتقادی بھی کسی خاص
زمانہ سے مخصوص نہیں ہے جیسے آج کل کے مورخین اور ارباب سیر
بڑے بلند بانگ دعاوے کے ساتھ حضرت عمر کو اسلامی فاتح اعظم
کہتے اور تمام اسلامی فتوحات اور افواج اسلامی کے غلبہ کا سہرا آپکے
سر باندھتے ہیں حالانکہ اس زمانہ میں خوشامد کا تو کوئی موقع ہی نہیں
جو کچھ بھی ہو وہ خوش اعتقادی ہو۔ اُس زمانہ میں خود حضرت عمر کے
منہ پر خوشامد اور خوش اعتقادی کے مخلوط جذبہ کا نتیجہ تھا کہ عام
طور پر کہا جاتا ہوگا کہ "یہ سب حضور کی برکت ہے اور آپ کا اثر ہو۔
پھر جب یہاں بیٹھے بیٹھے یہ حال ہے تو حضور خود اگر میدان جنگ
میں پہونچ جائیں تو کیا ہوگا۔ سپاہیوں کے دل ہاتھ بھر کے
ہو جائیں گے، دنیا کو زیر و زبر کر دینگے، پہاڑ بھی سامنے آئے تو

ہٹا کر راستہ پیدا کریں گے اور ایک دم کے اندر ہی ایرانی ملک
پر قبضہ کر لینگے"۔

یہ خیالات ہونگے جو عام طور پر حضرت عمر کے گوش زد کئے جاتے
ہونگے جن کا اثر یہ تھا کہ حضرت عمر تمام سابق تلخ تجربوں کے باوجود جنگ کے
میدان کو اپنے فتحمند قدموں سے عزت دینے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ موقع تھا کہ مدبر اسلام اور حقیقی محافظ ملت حضرت علی بن
ابی طالب کو اسلامی عزت و وقار کی نسبت خطرہ کا احساس ہوا اور
انھوں نے مناسب الفاظ میں حضرت عمر سے اپنے خیالات اظہار کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسالتمآب کے زمانہ میں متعدد بار
حضرت عمر کو ذمہ دارانہ حیثیت سے روانہ کیا گیا لیکن وہ
ایسا نازک موقع نہ تھا۔ حضرت عمر کی شخصیت اُس وقت کتنی نمایاں
سہی لیکن ایک فرد مسلمان سے زیادہ نہ تھی۔ اگر صورت حال دگرگوں
ہوئی اور شکست کی ناگوار صورت آئی تو وہ کتنی خجالت آمیز سہی لیکن
اسلام کی شکست کی مرادف نہیں ہو سکتی۔ رسولؐ اسلام تو موجود تھے
ایک دوسرے قابل اعتماد شخص کے ذریعہ سے وہ اس کمزوری کا تدارک
کر دیتے اور نتیجہ میں دشمنوں کو شکست دیتے تھے۔ جیسا کہ برابر ہوتا رہا
اور تاریخ اسلام میں وہ تمام واقعات محفوظ ہیں۔

لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ وہ جن اسباب کی بنا پر ہو بہر حال
حضرت عمر کو دنیائے اسلام کے لئے ایک ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی
اور خود مسلمانوں کے اندر آپ کے متعلق کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن
کفار کی نگاہ میں آپ بہر حال بادشاہ اسلام اور خلیفہ مسلمین اور جانشین
رسولؐ کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے اگر خدانخواستہ آپ کے
میدان جنگ جانے پر کوئی ناگوار صورت پیش آتی اور آپ کو میدان جنگ
چھوڑنا یا جنگ سے علحدہ ہونا پڑتا تو یہ اسلام کی شکست ہوتی جس کے
بعد پھر اسلام کو بارآوری حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت عمر یقیناً خود موقع کی نزاکت کا احساس رکھتے تھے اور
اُن کا دل اس اہم اقدام کو کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور قیاس یہ
بتلاتا ہے کہ صرف سرداران لشکر یا دوسرے عام افراد کا یہ مطالبہ
اور اصرار رہا ہوگا کہ جب کہ رسول برابر لڑائیوں میں خود شریک
ہوتے تھے خلیفہ رسول کیوں گھر میں بیٹھے رہیں اور میدان جنگ میں
مجاہدین کی صفوں کے اندر موجود نہ ہوں۔

اس لئے حضرت عمر کو گونہ تردد ہوا اور اسی لئے انھوں نے
حضرت علی سے مشورہ کیا

حضرت علی کے لئے یہ بہت نازک موقع تھا وہ بات جو

آپ کو جنگ میں جانے کا مشورہ دینے سے مانع تھی وہ ایسی نہیں
کہ اُس کو صاف لفظوں میں کہدیا جائے۔ دوسری طرف مشورہ کے
موقع پر صحیح رائے اور اپنے اصلی خیال کا ظاہر کردینا شریعت اسلام
اور انسانیت و اخلاق کا اہم فرض ہے اور پھر جبکہ مشورہ اتنا اہم ہے
جس میں اسلام کے وقار و عزت اور توہین و شکست کا سوال درپیش ہو۔
مگر کیا کہنا اُس ہمصفیر زبان وحی اور ترجمان حقائق قرآنی کی بلاغت
کا جس نے سب کچھ اس شائستہ پیرایہ میں کہدیا جس کو آج دنیا انتہائی
مدح و ثناء کے الفاظ سمجھکر اُس کو مقام افتخار میں پیش کرتی اور اپنے
ممدوح کے لئے طرۂ امتیاز سمجھتی ہے۔

پہلے حضرت نے ان خوشامدانہ نمائشی چاپلوسی کرنے والوں کے
خیال کی غلطی ظاہر کی ہے جو حضرت عمرؓ کے یہ ذہن نشین کرانا چاہتے تھے
کہ یہ سب حضور کا فیض ہے اور یہ تمام فتوحات آپکے دم قدم کی برکت
سے ہیں اور اگر آپ جنگ میں پہونچ جائیں تو پھر اس سے زیادہ فتوحات
ظاہر ہوں گے حضرت نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"یہ تو خدا نے (اپنے وعدہ کے ذریعہ سے) ذمہ داری کرلی ہے کہ وہ
اسلام کی طاقت و شوکت میں اضافہ کریگا اور اس میں کمزوری
پیدا نہ ہونے دیگا۔

وہ خدا جس نے ان مسلمانوں کی امداد کی اُسوقت جب یہ بیکس اور بے بس
تھے کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور اُن کی حفاظت کی جب وہ کم تھے
وہ اب بھی موجود ہے اور اُس کے لئے فنا نہیں ہے (لہٰذا یہ تو سمجھنا
ہی نہ چاہیے کہ اگر آپ نہ ہوئے تو اسلام کو شوکت حاصل ہی نہیں
ہوسکتی) اُسکے بعد آپ حضرت عمرؓ کی روانگی سے اختلاف کرتے ہوئے
فرماتے ہیں۔ آپ اگر دشمن کی طرف بنفس نفیس تشریف لے گئے اور
دشمن کا سامنا ہوا اور اُس وقت (خدانخواستہ) آپ کو میدانِ
جنگ سے ہٹنا پڑا یا (نصیب دشمناں) شکست ہوئی تو (افسر کے قدم
اُکھڑ جانے کے بعد) پھر مسلمانوں کا کوئی مرکز اُس دور و دراز ملک
میں نہ ہوگا اور آپ کے (شکست کھانے کے) بعد کوئی ایسا نہ رہے گا
جس کی طرف وہ رجوع کریں۔

اس وقت تو یہ ہے کہ شاہی مرکز مدینہ میں موجود ہے اور اگر ایک
افسر فوج کو شکست ہوئی اور لشکر کے قدم اُٹھے تو افواج منظم طریقہ
سے واپس آئیں گے اور دوسرا بہادر افسر بھیجا جاسکتا ہے۔ لیکن
اگر بادشاہ خلیفۃ المسلمین کو شکست ہوئی تو پھر اُس کے تدارک کی
کوئی صورت نہیں باقی رہتی، اس صورت میں یقیناً مسلمانوں کا
شیرازہ منتشر ہو جائیگا اور وہ آندھی میں اڑتے ہوئے پتوں کیطرح

پراگندہ ہو جائیں گے

اس کے بعد حضرت صورت حال کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش فرماتے ہیں کہ "بہتر ہے آپ اُن کی جانب ایک ایسے شخص کو روانہ فرمائیں جسے لڑائی کا تجربہ ہو اور اُس کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجے جو لڑائی کی سختیوں کو برداشت کر سکیں اور اسلام کے خیرخواہ ہوں (لشکر اور سردار لشکر کے یہ اوصاف و قیود حضرت علی کے نقطۂ نظر کو بہت روشن طریقہ سے واضح کرتے ہیں)

اس صورت میں اگر خداوند عالم نے کامیابی عطا فرمائی تو کیا کہنا اور اگر پھر بھی شکست ہوئی تو آپ تو ہیں ہی وہ فوج آپ کے پاس پلٹ کر واپس آئیگی اور آپ دوسری فوج روانہ کر سکیں گے۔

یہ تھا مشورہ جو حضرت نے دیا اور حقیقۃً مشورہ ایسا تھا جسے حضرت عمر کے دل نے قبول کر لیا اور انھوں نے جنگ میں جانے کے خیال کو ترک کر دیا۔

دوسرا مشورہ غزوۂ فارس کے متعلق

جب سرداران لشکر وغیرہ نے پھر حضرت عمر کو پریشان کیا اور یہ کہا کہ اگر آپ جنگ میں چلے جائیں تو سب کام بن جائیں اس لئے کہ دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے مسلمانوں کا لشکر کم ہے۔ اگر آپ کہیں قدم اوٹھائیں اور

عمل کھڑے ہوں تو قبائل عرب میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ جائیگی کہ بادشاہ سلامت خود جنگ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں اور اس طرح تمام اطراف و جوانب سے مور و ملخ کی طرح لشکر سمٹ آئیگا حضرت عمر ان لوگوں کے اصرار سے پھر پریشان ہوئے اور وہی پہلا نسخہ عمل میں لائے کہ حضرت علی سے مشورہ لیں اور جب آپ اختلاف کریں تو یہی آپکے جنگ سے باز رہنے کی سند قرار پائے۔ اس موقع پر بھی کوئی تازہ امر نہ تھا۔ حضرت علی کی نظر میں تمام وہی پہلو موجود تھے جو گذشتہ مشورہ میں آپکے سامنے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر حضرت عمر سے جنگ میں تشریف لے جانے پر اصرار کرنے والوں کے خیالات کو مد نظر رکھتے ہوئے حضرت نے جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"اس امر یعنی اسلام کی فتح و نصرت یا شکست و ہزیمت کثرت و قلت پر موقوف نہیں رہی ہے، یہ تو خدا کا دین ہے کہ جس کو اُس نے غالب کیا اور اُسی کی فوج ہے جس کی اُس نے امداد کی یہاں تک کہ وہ پہونچی کامیابی کے اُس درجہ تک کہ جہاں تک پہونچی اور ہم سے خداوند عالم کی جانب سے وعدہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے وعدہ کو پورا ضرور کریگا اور اپنے لشکر کی امداد کرے گا۔

امور انتظامی کے ساتھ قائم یعنی خلافت مسلمین کے ذمہ دار شخص کی
حیثیت وہ ہوتی ہے جو رشتۂ قلادہ کو موتیوں کی نسبت حاصل ہے کہ
یہ اُن کی شیرازہ بندی کرتا اور اُن کی جمع آوری رکھتا ہے، اگر یہ رشتہ
ٹوٹ جائے تو موتی بکھر جائیں گے اور تتر بتر ہو جائیں گے اور کبھی
اُن کا اجتماع نہ ہو سکے گا (یہ حضرت نے ایک کلیہ کی صورت سے ارشاد
فرمایا ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ بالخصوص نہیں نکالا جا سکتا کہ "حضرت
علیؑ نے حضرت عمر کی ذات والا صفات کو مسلمانوں کا مایۂ نظام فرمایا
اور فرمایا کہ یہ نظام آپکے بعد قیامت تک پھر کبھی نہ ہو گا اس لئے کہ آپ
قیم بالامر ہیں"۔ یہ نتیجہ تو جب نکلتا جب حضرت خصوصیت کے ساتھ
فرماتے کہ آپ کی مثال وہ ہے جو رشتہ کو موتیوں کے ساتھ ہوتی ہے بیشک
کلّیتہً ایسا ہی ہے کہ ہر بادشاہ اپنے زیر حکومت رعایا کے لئے باعث
انتظام و شیرازہ بندی ہوتا ہے اور اگر وہ ہٹ جائے تو شیرازہ منتشر
ہو جائے گا۔ اور جب تک پھر کوئی بحیثیت بادشاہ اُس شیرازہ کو
مجتمع نہ کرے وہ مجتمع نہیں ہو سکتا)۔

اس کے بعد حضرت اس خیال کو رد کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کی
تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں کم ہے فرماتے ہیں کہ عربوں کی تعداد
(بمقابلہ اپنے مخالفین کے اگرچہ کم ہے لیکن وہ زیادہ تعداد کے ہموزن ہی

اسلام کے سبب سے اور اُن کے لئے عزت حاصل ہے اُن کے اجتماع کے
سبب سے آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی جگہ پر قطب کی طرح قائم رہیں اور
عربوں کو چکی کی طرح یہیں سے بیٹھے بیٹھے گردش دیں اور انہی کو
آتش حرب میں ڈالیں اس لئے کہ اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو یہ تو
ہو گا (جیسا کہ اُن لوگوں کا خیال ہے) کہ چاروں طرف سے عرب ٹوٹ
پڑیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلامی بلاد خالی ہو جائیں اور
آپ کو ان مقامات کا خیال جن کو آپ بے حفاظت چھوڑتے ہیں
زیادہ اہم معلوم ہونے لگے اور پھر خاص بات تو یہ ہے کہ عجم آپ
کو میدان جنگ میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ شخص عرب کی جڑ ہے
اگر اس کو کاٹ ڈالو گے تو راحت پا جاؤ گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا
کہ وہ آپ پر شدت سے حملہ کریں گے اور پوری نظر اُن کی آپ پر
ہو گی۔ (ایک بہادر کے جوش و ولولہ کے لئے یہ الفاظ تازیانہ کا کام
کر سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر محتاط تھے حضرت علیؑ نے
جو یہ پہلو پیش نظر کر دیا تو آپنے خود جنگ میں جانے کے خیال کو
ترک فرما دیا)

باقی رہا یہ جو آپ نے ذکر کیا کہ فوج عجم مسلمانوں کے قتال کے
لئے روانہ ہو چکی ہے تو اللہ سبحانہ کو اُن کی یہ روانگی آپ سے زیادہ

ناپسند ہے اور وہ جس چیز کو ناپسند کرے اُس کے بدل دینے پر قادر ہے اور جو آپ نے اُن کی کثرت بیان کی تو بات یہ ہے کہ ہم لوگ زمانہ گذشتہ میں اپنی کثرت کے برتے پر جنگ نہ کرتے تھے بلکہ خدا کی مدد پر بھروسا کرکے لڑتے تھے۔"

(طرزِ کلام سے ظاہر ہے کہ یہ حقائق آلٰہیہ مخاطب کے پیش نظر نہیں ہیں اور حضرت علی اُن کے اوپر خاص طور سے توجہ دلا رہے ہیں)

یہ مشورے خالص انسانی ہمدردی اور اسلامی مفاد کے لحاظ سے تھے جن میں ذاتی دوستی دشمنی کا سوال بلند خیال اور تنگ نظری سے علٰحدہ افراد کے یہاں پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اسی طرح مسائل شرعیہ میں امداد لینے کے موقع پر حضرت علیؑ کا مسائل سے مطلع کر دینا اور احکام شرعیہ کا بتلا دینا یا قضایا کا فیصلہ کر دینا یہ تمام باتیں اسی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔

کیا اس موقع پر حضرت علیؑ ایسی پاک نفس و پاکباز بلکہ معلم انسانیت ہستی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اگر کسی سے دشمنی یا اختلاف خیال رکھتے ہوں تو اس دشمنی کی بنا پر مشورہ کے موقع پر غلط رائے دیں۔ مسائل شرعیہ غلط بتلائیں اور قضایا کا فیصلہ کچھ کا کچھ کر دیں۔

پھر اگر یہ حضرت کے تقوی و طہارت اور قدس و حقانیت کے خلاف امر ہے تو اس مشورہ کے دینے مسائل کے بتلانے اور قضایا کے صحیح طور سے فیصلہ کر دینے کو اس امر کی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا کہ حضرت کو کوئی ذاتی اختلاف نہ تھا اور وہ حضرت عمر کو انتہائی دوست رکھتے تھے۔

فرض شناسی اور ذمہ داری کا احساس اور دیانت و امانتداری وہ چیز ہے جس میں دوست و دشمن کی تفریق باقی نہیں رہتی۔ تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ رسالتمآبؐ کفار قریش کے امانتدار تھے یعنی وہ لوگ آپ کے پاس امانتیں رکھواتے تھے اور حضرت اُن کی اس طرح حفاظت کرتے تھے کہ حضرت کو امین کا لقب مل گیا تھا۔ یہ سلسلہ بعثت کے ہوتے ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ بعد بعثت ہجرت کے موقع تک کفار قریش کی امانتیں آپ کے پاس موجود تھیں اور حضرت نے اُن امانتوں کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا کہ اپنے عزیز ترین بھائی علیؑ بن ابیطالب کو انھی امانتوں کے ادا کرنے کے لئے انتہائی خطرہ کے اندر مکہ معظمہ میں چھوڑ کر ہجرت فرمائی۔ کیا میں دنیائے اسلام سے دریافت کر سکتا ہوں کہ حضرت رسول کفار قریش سے کوئی محبت و الفت رکھتے تھے یا اختلاف؟ پہلے جزو کی نفی آیۂ قرانی سے ہو جاتی ہے کہ لاتجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ و رسولہ مومن اور

کافر میں دوستی ناممکن ہے۔ تو ماننا پڑیگا کہ حضرت کو کفار قریش سے محبت نہ تھی بلکہ اختلاف تھا۔ پھر اُن کی امانتوں کی حفاظت میں اتنا اہتمام! اس کے کیا معنی؟ یہ وہی فرض شناسی اور دیانت و امانت کا لحاظ تھا جس میں محبت و عداوت کے سوال کا موقع ہی نہیں۔

اگر حضرت رسول کا کفار قریش کی امانتیں اپنے پاس رکھنا اور اُن کی حفاظت میں انتہائی اہتمام فرمانا اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ آپ اُن سے کوئی ذاتی اختلاف نہ رکھتے تھے تو اُن کے وصی و جانشین حضرت علی کا بھی اپنے مخالفین کے لئے مشورہ دینے مسائل بتلانے قضایا کا فیصلہ کرنے میں امانت و دیانت داری کے فرض کو ملحوظ رکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ آپ اُن سے کوئی ذاتی اختلاف نہ رکھتے تھے۔

خلیفہ سوم سے تخاطب

نہج البلاغہ مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۳۲۳ سے امیر المومنین کا وہ مخاطبہ پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے حضرت عثمان سے اُس وقت کیا ہے جب لوگوں نے اُن کے خلاف شورش برپا کی ہے اور جناب امیر سے آکر اُن کے شکایات پیش کئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں

مسلمانوں کے ساتھ انتہائی مظالم ہو رہے تھے۔ اور اسلامی ممالک میں ایک بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ بڑے بڑے صحابہ کی زد و کوب ہوتی تھی۔ اموال غنیمت اپنے عزیزوں کو تقسیم کر دئے جاتے تھے اور دوسرے مسلمان محروم رہتے تھے۔

یہی تمام باتیں تھیں جنھیں امیر المومنین ؑ کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ خواہش کی گئی کہ آپ عثمان کو جا کر سمجھائیے۔ یہ موقع ہے کہ آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور حسب ذیل الفاظ میں ہدایت شروع کی۔

والله ما ادری ما اقول لک ما اعرف شیئاً تجہلہ ولا ادلک علی شیئ لا تعرفہ ما سبقناک الی شیئ فنخبرک عنہ ولا خلونا بشیئ فنبلغہ وقد رأیت کما رأینا وسمعت کما سمعنا وصحبت رسول الله کما صحبنا وما ابن ابی قحافۃ ولا ابن الخطاب اولی بعمل الحق منک وانت اقرب الی رسول الله صلی الله علیہ و آلہ وشیجۃ رحم منہما وقد نلت من صہرہ ما لم ینالا فالله الله فی نفسک فانک والله ما تبصر من عمی ولا تعلم من جہل فان الطرق لواضحۃ وان اعلام الدین لقائمۃ فاعلم ان افضل عباد الله عند الله امام عادل ہدی وہدی فاقام سنۃ معلومۃ و امات بدعۃ مجہولۃ وان السنن لنیرۃ لہا اعلام وان البدع

نظاهرة لها اعلام و ان شر الناس عند الله امام جائر ضل و ضل به فامات سنة مأخوذة و احيا بدعة متروكة و انی سمعت رسول الله صلی الله علیه و آله یقول یؤتی یوم القیامة بالامام الجائر و لیس معه نصیر و لا عاذر یلقی فی نار جهنم فیدور فیها کما تدور الرحی ثم یرتبط فی قعرها.

"خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ کوئی نئی بات ایسی نہیں ہے جو مجھے معلوم ہو اور تمھیں معلوم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی اطلاع مجھے ہے جو تمھیں حاصل نہ ہو۔ تم سے پہلے مجھے کسی حالت کی ایسی خبر نہیں پہونچی ہے جس کی تمھیں اطلاع دوں اور نہ ہمیں تنہا کوئی بات پہونچی ہے جو تم کو پہونچائی جائے حالانکہ تم نے بھی (سیرت رسول کو) دیکھا ہے جس طرح ہم نے دیکھا ہے اور (اقوال رسول کو) سنا ہے جس طرح ہم نے سنا ہے اور ہماری طرح رسول اللہ کی صحبت بھی اٹھائی ہے اور ابو بکر اور عمر حق پر عمل کرنے کے کچھ تم سے زیادہ حق دار نہ تھے حالانکہ تمھارا رشتہ قرابت کا رسول اللہ کے ساتھ اُن سے زیادہ ہے۔ اور جس طرح کی دامادی تم کو حاصل ہے وہ اُنھیں حاصل نہ تھی۔ پس خدا سے ڈرو۔ خدا سے ڈرو اپنے بارے میں۔ بخدا تم اندھے پن سے آنکھیں نہیں کھولتے اور جہالت کے بدلے علم سے کام نہیں لیتے حالانکہ راستے

روشن ہیں اور دینی تعلیمات بالکل ظاہر ہیں۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ تمام بندگان خدا میں سب سے بہتر وہ عادل حاکم ہے جو ہدایت یافتہ ہو اور اُس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ وہ سنت کو قائم کرے اور بدعت کو فنا کرے۔ اور خدا کی سنتیں بالکل روشن ہیں اُن پر نشانیاں موجود ہیں اور بدعتیں بھی بالکل ظاہر ہیں اُن پر بھی نشانیاں ہیں اور بدترین خلق وہ ظالم حاکم ہے جو خود بھی گمراہ ہو اور لوگ بھی اُس کے ہاتھوں گمراہی میں مبتلا ہوں وہ اُس سنت کو جو رسول سے حاصل ہوئی ہے مردہ کرے اور ایسی بدعت کو جو اب تک جاری نہیں ہے قائم کرے اور میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ روز قیامت ظالم حاکم کو لایا جائیگا اس طرح کہ اُس کا کوئی فریادرس اور مددگار نہ ہوگا وہ آتش جہنم میں ڈالدیا جائیگا تو اُس میں چکر کھائیگا جس طرح چکی گھومتی ہے۔ پھر جہنم کی تہہ میں بیٹھ جائیگا۔"

اسمیں نہج کی جانب سے ابتدائی فقرات اپنے مفید مطلب سمجھ کر نقل کئے گئے ہیں۔ چونکہ حکمت و موعظۂ حسنہ کے اصول پر اُن کا طرز ادا خوش گوار تھا اور آخری فقرات جن میں نصیحت کے الفاظ میں رفتہ رفتہ تلخی اور تیزی پیدا ہوئی تھی اور جس کا خاتمہ آتش جہنم کے تذکرہ پر ہوا تھا انھیں اپنے مسلک اور مقصد کے خلاف چھوڑ کر ترک کیا گیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ شرعی احکام کی ذمہ داریاں اُسی وقت عائد ہوتی ہیں جب انسان کو اُن کا علم بھی حاصل ہو۔ ناواقفیت میں جو امور انجام پاتے ہیں اُن میں جرم بہت سبک ہوتا ہے اور اس لئے الزام میں کوئی وزن بھی نہیں ہوتا۔

عثمان جو کچھ کرتے تھے "دیدہ و دانستہ" کرتے تھے۔ اس کے اظہار کی تمہید ہے وہ جسے آج انتہائی فضیلت سمجھ کر ذکر کیا جا رہا ہے۔

کون سی بات ہے جو تم کو معلوم نہیں۔ کیا رسول اللہ کی سیرت کو ہم نے دیکھا ہے تم نے نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے حقوق اور نیز اصول مساوات کے متعلق رسول کے تعلیمات کو ہم نے سنا ہی تم نے نہیں سنا۔ پھر آخر اُن تعلیمات سے یہ چشم پوشی کیوں؟ اُن ہدایات پر عمل کرنے میں یہ کوتاہی کس لئے؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس علم اور اطلاع سے مراد اُن باتوں پر اطلاع ہے جو موجودہ حالات میں حضرت عثمان پر اتمام حجت سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو محل و موقع سے وابستہ ہو سکتی ہے۔

اس کو دیگر تمام علوم و کمالات یا معرفت باری تعالیٰ یا مسائل فقہیہ کی واقفیت وغیرہ سے کیا تعلق؟ جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ حضرت عثمان بس، بالکل جناب امیر کے مساوی تھے اور کوئی فرق نہ تھا۔

آخر اُس تمام علم و معرفت کے باوجود اس کے معنی پھر کیا ہو سکتے ہیں کہ انک لا تبصر من عمی و لا تعلم من جہل "تم اندھے ہو رہے ہو اور آنکھیں نہیں کھولتے جہالت میں مبتلا ہو اور علم سے کام نہیں لیتے"۔

صحبت رسول کے حصول سے صرف یہ مقصود ہے کہ اُس درجہ تک جس کی تمہیں اپنے عمل میں لاج رکھنا چاہئے۔ تم کو یہ شرف بھی حاصل ہی۔ نہ یہ کہ وقت زمانہ اور مقدار کے اعتبار سے نہ صحبت بالکل اُس صحبت کے برابر ہی ہے۔ جو امیر المومنین اور آپ کے بعد دوسرے سابقین اسلام کو حاصل تھی۔ یہ تو واقعہ کے بالکل خلاف ہی۔

یہ معنی کیسے قرار دئے جا سکتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے تو امیر المومنین الزام اور جرم کو سنگین بنا رہے ہیں۔ اسی لئے اس کلام کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے:—

فلا تکونن لمروان سیقۃ یسوقک حیث شاء بعد جلال السن و تقضی العمر.

"مروان کے ہاتھ میں بالکل بھیڑ بکری کی طرح نہ بنو کہ جدھر چاہے وہ تمہیں لے جلے جبکہ تم سن رسیدہ ہو گئے ہو اور عمر گذر گئی ہے"۔

"دامادی" کی لفظ پر بڑا زور دیا جاتا ہے حالانکہ جو شیعی علما اس امر کے منکر ہیں کہ رسول اللہ کی صلبی بیٹیاں حضرت عثمان کو منسوب تھیں

وہ بھی کہتے ہیں کہ وہ حضرت کی ربیبہ تھیں یعنی جناب خدیجہ کے ساتھ آئی تھیں اور حضرت کی پرورش میں رہی تھیں اس لئے آپ کی بیٹیاں کہلاتی تھیں پھر جس طرح کی وہ رسول کی بیٹیاں تھیں اُسی طرح کے حضرت عثمان داماد بھی سمجھے جا سکتے تھے۔ مگر حضرات شیخین کو اس طرح کی بھی بات حاصل نہ تھی۔ اسی لئے اس امر پر آپنے موازنہ عثمان اور حضرت ابوبکر و عمر میں فرمایا ہے۔ یہاں آپ اپنی ذات کو بالکل معرض بحث میں نہیں لائے ہیں۔ اس لئے کہ آپ اپنی دامادی کی شان میں متفرد تھے۔

پھر اس پر اتنا زور دینے سے حاصل کیا ہے جبکہ وہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی بحث ہے۔

اگر وہ دونوں رسول اللہ کی صلبی بیٹیاں بھی فرض کر لی جائیں تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جبکہ وہ جناب عثمان سے پہلے دو صریحی کافروں کو منسوب ہو چکی تھیں۔ رہ گیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جناب عثمان کامل الایمان تھے۔ اس میں کوئی کامیابی حاصل ہونا مشکل ہے اس لئے کہ عقد نکاح کی صحت میں شرعاً ظاہری اسلام کافی ہے۔

سب سے زیادہ اس کلام میں قابل لحاظ وہ جزو ہے جس میں ظالم حاکم کی پاداش ذکر کی گئی ہے اور عثمان کو متنبہ کیا گیا ہے۔

اُس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مخاطب کے طرز عمل کو ظالمانہ

قرار دے رہے ہیں۔ نیز ظالم کے لئے اس وعید کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وعید سے کوئی جماعت مستثنیٰ نہیں ہے اور نہ کسی فرد کو اس سے علٰحدگی کا پروانہ ملا ہے ورنہ حضرت عثمان کے مقابلہ میں اس وعید کو ذکر کرنے کا کوئی حاصل نہ تھا اور کم از کم حضرت عثمان ہی جواب میں اپنے اُس پروانۂ نجات کا ذکر کر دیتے۔ پھر اگر حضرت عثمان اس کے بعد اپنے سابقہ طرزِ عمل سے علٰحدہ نظر آئیں تب تو ٹھیک ہی ورنہ حضرت علی کے عقیدہ اور قول کے مطابق وہ پیغام جو آپنے رسول کی زبانی نقل کیا ہے حضرت عثمان کے لئے خوش اعتقادی کی دنیا کو بالکل ویران کر دیتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس تقریر کے جواب میں جناب عثمان نے بہت عاجزی کے ساتھ اپنے مظالم کا اقرار کیا اور کہا کہ "آپ ان لوگوں سے کچھ مہلت حاصل کر لیجئے تو میں ان کے مظالم کا تدارک کر دونگا"۔

مگر یہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان نے اس وعدہ کو پورا نہیں کیا اور آپ آخر تک اپنے طرز عمل پر قائم رہے۔ اس کے بعد دنیا کو اختیار ہے کہ وہ جناب امیر کے مذکورہ بیانات کے ماتحت جن پر حضرت عثمان کے اعتراف کی مہر بھی ہو چکی ہے جو رائے چاہے قائم کرے۔

معاویہ اور اہل شام کی نسبت آپ کے آراء و اقوال

(۱) نہج البلاغہ جلد ا صـ ۲۱۱

انظر الی ضلیل قد نعق بالشام وفحص برایاتہ فی ضواحی کوفان.

"میں ایک انتہائی گمراہ شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ اُس نے شام میں آواز بلند کی ہے اور کوفہ کے بیرونی اطراف میں اپنے جھنڈوں کو گاڑ دیا ہے۔"

اس میں آپ نے امیر شام کو ایک انتہائی "گمراہ شخص" کی لفظ سے یاد کیا ہے۔

(۲) جلد دوم صـ ۸۰۷ میں آپ نے خود معاویہ کو اُن کے خط کے جواب میں لکھا ہے:-

نمقتها بضلالك وامضيتها بسوء رأيك وكتاب امرئ ليس له بصر يهديه ولا قائد يرشده قد دعاه الهوى فاجابه وقاده الضلال فاتبعه.

تو نے اُس خط کو اپنی گمراہی سے لکھا ہی اور اپنی غلطی سے روانہ کیا ہی وہ ایک ایسے شخص کا خط ہے جس کے قوت بینائی موجود ہی نہیں کہ وہ اُس کی ہدایت کرے اور نہ کوئی رہنما موجود ہے جو اُسے راستہ بتلائے صرف خواہش نفس کی دعوت پر آمادہ ہوا ہے اور گمراہی نے اُس کو کھینچا ہے جس پر وہ چل کھڑا ہوا ہے"۔

(۳) جلد ۲ صـ ۲۱۷ میں ہے:-

انّی من ضلالهم الّذی هم فیه والهدی الّذی انا علیه لعلی بصیرة من نفسی ویقین من ربّی.

"میں ان لوگوں کی اس گمراہی سے جس میں وہ مبتلا ہیں اور اس ہدایت سے جس پر میں قائم ہوں پورے طور پر مطمئن ہوں اور اپنے خدا کی جانب سے یقین کے درجہ پر فائز ہوں"۔

(۴) جلد اوّل صـ ۱۰۹ میں آپ نے فرمایا ہے:-

الا وانّ معاویة قاد لمّة من الغواة وعمّس علیهم الخبر حتّی جعلوا نحورهم اغراض المنیّة.

"آگاہ ہو کہ معاویہ نے گمراہ لوگوں کی ایک جماعت کو کھینچ کر میدان جنگ میں بلایا ہے اور حقیقت حال کو اُن پر مخفی رکھا ہے یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنے سینوں کو موت کا نشانہ بنا دیا ہے۔

(۵) صـ ۱۱

لا تقتلوا الخوارج بعدی فلیس من طلب الحقّ فاخطأه کمن طلب الباطل فادرکه (یعنی معاویة واصحابه)

خوارج کے قتل کے میرے بعد درپے نہ ہونا کیونکہ وہ شخص جو حق کا طالب ہو لیکن غلطی کر جائے اُس کے مثل نہیں ہی جو باطل کو

طلب کریں اور اُسے پا بھی جائے (اس سے مقصود آپ کا معاویہ اور اُس کے ساتھی ہیں)"۔

اس عبارت میں آپ نے ان لوگوں کو خوارج سے بدتر بتلایا ہے چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے:۔ فالخوارج علی ما بہم احسن حالاً منھم "خوارج اپنی گمراہی کے باوجود ان سے بہتر حالت رکھتے ہیں"

(۲) جلد ۲ صفحہ ۱۷

مااسلموا ولکن استسلموا واسرّوا الکفر فلمّا وجدوا اعوانا علیہ اظھروہ۔

"یہ لوگ اسلام نہیں لائے بلکہ ظاہری طور پر تابع اسلام ہو گئے تھے اور کفر کو پوشیدہ کر لیا تھا اب جبکہ اُن کو مددگار مل گئے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے تو اُسی دشمنیٔ اسلام کے جذبہ کو ظاہر کر دیا"

تعجب ہے کہ امیر المومنین کے ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ معاویہ اور اُن کے ساتھیوں کو مومن کامل سمجھتے تھے اور اس کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں آپ کے یہ الفاظ جو آپ نے گشتی فرمان کی صورت سے جنگ صفین کے بعد امراء ممالک کو لکھ کر بھیجے تھے اور جس میں جنگ صفین کی روئداد سے اُنھیں مطلع کیا گیا تھا۔

جلد دوم صفحہ ۱۱۸۔

وکان بدءُ امرنا انّا التقینا والقوم من اھل الشام والظاھر انّ ربّنا واحد ونبیّنا واحد ودعوتنا فی الاسلام واحدۃ ولا نستزیدھم فی الایمان باللّٰہ والتصدیق برسولہ ولا یستزیدوننا الامر واحد الّا ما اختلفنا فیہ من دم عثمان ونحن منہ براء

"ابتدائی حالات یہ ہیں کہ ہم سے اور شام والوں کی ایک جماعت سے مقابلہ ہوا اس صورت میں کہ ظاہری طور پر ہمارا خدا ایک تھا۔ ہمارا نبی ایک تھا۔ اور اسلام میں ہماری آواز ایک تھی اور خدا و رسول پر ایمان کے بارے میں نہ ہم اُن سے زیادتی کے طالب تھے اور نہ وہ ہم سے۔ سب باتوں میں اتفاق تھا مگر بس وہ جو ہمارے درمیان عثمان کے خون میں خلاف ہو گیا تھا اور واقعہ یہ تھا کہ ہم اُس سے بالکل بری تھے"۔

اس میں "ظاہر" کی لفظ سے بالکل ظاہر ہے کہ یہ اتحاد ایمان باللہ اور تصدیق رسول وغیرہ صرف ظاہری حیثیت سے تھا۔ باطن اس کے سوا کچھ اور تھا اور یہی وہ ہے جس کی تفصیل اس کے پہلے والے کلام میں موجود ہے۔ پھر آخر اس کو ان لوگوں کے واقعی ایمان سے کیا واسطہ؟

عصمت

کہا جاتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اپنے معصوم ہونے کی

نفی کی ہے۔

اس کے لئے نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۴۶۳ سے جس عبارت کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے:۔

فانی لست فی نفسی بفوق ان اخطئ ولا آمن ذلک من فعلی الا ان یکفی اللہ فی نفسی ما ھو املک بہ منی

"میں اپنے نفس کے لحاظ سے اس سے بالاتر نہیں ہوں کہ غلطی کروں اور نہ مجھے اپنے فعل سے اس کا اطمینان ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کہ خدا میرے نفسانی تقاضے کو میرے قابو میں رکھے جس پہ وہ مجھ سے زیادہ قادر ہے۔"

اس کے آخری فقرہ کو نظر انداز کر کے پہلے ٹکڑے سے مطلب نکالا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ نفسانی خواہشیں ایک معصوم میں بھی پائی جاتی ہیں مگر جبکہ "عصمت" ایک خداوندی لطف ہے تو آخری جزو میں جو استثنا کیا گیا ہے وہی عصمت کی طرف اشارہ کا حامل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس سے امیر المومنین ع کی عصمت کے خلاف استدلال پیش کر سکتے ہیں وہ حضرت یوسف کو یقیناً عصمت کے حدود سے خارج سمجھ چکے ہیں اُن کے ان الفاظ سے جو قرآن میں درج ہیں کہ ما ابرء نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی "میں اپنے نفس کو بری

نہیں کرتا کیونکہ نفس تو برائیوں کی تحریک کرتا ہی ہے مگر یہ کہ خدا کا رحم شامل حال ہو"

حضرت یوسفؑ کے الفاظ حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے لفظوں سے زیادہ نفس کے مجرمانہ تقاضے کا اظہار کرتے ہیں مگر وہاں (الا ما رحم ربی) کے الفاظ میں جو استثنا ہے وہ ہی امیر المومنینؑ کے کلام میں (الا ان یکفی اللہ الخ) کے الفاظ میں موجود ہے۔ نبی اور امام کا لب و لہجہ اس مقام پر بالکل متحد ہے۔ اور اُس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور رسول اللہ کے یہ الفاظ بھی قرآن میں موجود ہیں کہ:۔ ما انا الا بشر مثلکم یوحی الیّ پہلے ٹکڑے سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ کو کوئی امتیاز عام افراد انسانی سے ہے ہی نہیں مگر یوحی الیّ سے اُس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جو آپ کو خدا کی جانب سے حاصل ہے۔

امیر المومنین کا درجہ اور خصوصیت کس حد پہ تھی اس کو ملاحظہ کیجئے اس خطبہ میں:۔

جلد اول صہ ۴۱۶۔

قد علمتم موضعی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ بالقرابۃ القریبۃ والمنزلۃ الخصیصۃ وضعنی فی حجرہ و انا ولد یضمنی الی صدرہ ویکنفنی الی فراشہ ویمسنی

جسده ویشممنی عرفه وکان یمضغ الشئ ثم یلقمنیه وما وجد لی کذبة فی قول ولا خطلة فی فعل۔

"تم کو معلوم ہے میرا درجہ جو رسول اللہ کے ساتھ قریبی قرابت اور مخصوص مرتبہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ آپ نے مجکو اپنی تربیت میں لیا اُس وقت جب میں بچہ تھا، آپ مجکو اپنے سینہ سے لگاتے تھے اور بچھونے پر اپنے پہلو میں سلاتے تھے اور مجھ سے اپنے جسد کو متصل کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے اور غذا چبا کر میرے مُنہ میں دیتے تھے اور آپ نے نہ میرے اقوال میں کبھی کوئی غلط بیانی دیکھی اور نہ افعال میں کوئی لغزش"۔

یہ ہے عصمت کا اظہار جس کے قول و فعل میں رسول کو خطا اور غلطی نظر نہ آئے وہ معصوم نہیں تو کیا ہے؟

ص ۴۱۷

ولقد سمعت رنة الشیطان حین نزل الوحی علیه صلی الله علیه وآله فقلت یا رسول الله ما هذه الرنة فقال هذا الشیطان أیس من عبادته، انك تسمع ما اسمع وتری ما اری الا انك لست بنبی ولکنك وزیر۔

"میں نے شیطان کی فریاد سنی اُس وقت جب حضرت پر وحی نازل

ہوئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ یہ فریاد کیسی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ شیطان ہے جو آج اپنی پرستش سے مایوس ہو گیا۔ تم تو سنتے ہو وہ جو میں سنتا ہوں اور دیکھتے ہو وہ جو میں دیکھتا ہوں۔ مگر تم نبی نہیں ہو۔ بے شک وزیر ہو"۔

حضرت علی بن ابیطالب کے مرتبہ سے ناشناس افراد یقیناً اس کو غلو سمجھیں گے مگر وہ ایک حقیقت ہے جسے امیر المومنین نے رسول اللہ کی زبانی بیان کیا ہے۔

یہ امیر المومنین علی بن ابیطالب کے اقوال و تعلیمات تمام مسلمانوں کی واقفیت کے لئے پیش ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان اقوال پر غور کیا جائے تو مسلمانوں میں افتراق کی خلیجیں بہت کم ہو جائیں اور کم از کم وہ منافرت جو باہمی پائی جاتی ہے دور ہو جائے۔ کیونکہ یہ اُس ہستی کے تعلیمات ہیں جو تمام مسلمانوں میں نقطۂ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے کسی نہ کسی درجہ پر تمام مسلمان امام خلق اور پیشوائے مطلق تسلیم کرتے ہیں۔ والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ
۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۷ھ

دین حق کی نصرت کے لیئے

کیا آپ تھوڑی سی مالی قربانی بھی نہیں کر سکتے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو جلد از جلد امامیہ مشن (رجسٹرڈ) کی ممبری قبول فرما کر ناصرین اہلبیت علیہم السلام کی فہرست میں اپنا نام نامی درج کرا لیجیے

۱- چندہ لائف ممبران — کم از کم پچاس روپیہ یکمشت
۲- چندہ ممبران خصوصی — کم از کم پانچ روپیہ سالانہ
۳- چندہ ممبران عمومی — کم از کم ایک روپیہ سالانہ

قواعد ممبری و حقوق ممبران

۱- لائف ممبر - فیس پچاس روپیہ یکمشت عمر میں صرف ایک مرتبہ یا اقساطاً ایک سال تک مبلغ پانچ روپیہ ماہوار - یہ رقم وصول ہوتے ہی جملہ رسائل شایع شدہ بلا طلب و بلاقیمت ممبر کی خدمت میں روانہ کیے جائینگے اور آئندہ جو رسالہ بھی شایع ہوگا بلاطلب و بلاقیمت بھیجا جائیگا باقساط ادا کرنے والے حضرات کو کم از کم تین قسطیں وصول ہو جانے پر جملہ رسائل روانہ ہو سکیں گے۔

۲- ممبر خصوصی - فیس پانچ روپیہ سالانہ - شایع شدہ رسائل بشرط طلب نصف قیمت پر اور آئندہ جتنے رسالہ زمانہ ممبری میں شایع ہونگے بلا طلب و بلاقیمت روانہ ہوا کرینگے

۳- ممبر عمومی - فیس ایک روپیہ سالانہ جملہ رسائل شایع شدہ بشرط طلب کامل قیمت پر اور زمانہ ممبری میں شایع ہونیوالے رسائل بشرط طلب نصف قیمت پر روانہ کیے جائیں گے (جو رسالہ طلب فرمایا جائے حسب قرارداد مجلس انتظامیہ اسکی نصف قیمت قبل سے بصورت ٹکٹ وصول ہونا ضروری ہے)

فہرست رسائل امامیہ مشن - رجسٹرڈ - لکھنؤ

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۱	قاتلان حسین کا مذہب	۴ر	۱ر	۲۰	دی مارٹیرڈم آف حسین	۲ر	۳ر
۲	تحریف قرآن کی حقیقت ختم	۶ر	۱ر	۲۱	اسوۂ حسینی	۰۰ر	۱ر
۳	مولود کعبہ (ختم)	۱ر	۳ر	۲۲	جنگ صفین	۳ر	۵ر
۴	وجود حجت	۴ر	۱ر	۲۳	تذکرۂ حفاظ شیعہ حصہ اول	۴ر	۱ر
۵	اصول دین اور قرآن	۴ر	۱ر	۲۴	” ” حصہ دوم	۵ر	۱ر
۶	اتحاد الفریقین حصہ اول	۴ر	۱ر	۲۵	مقصود کعبہ	۱ر	۳ر
۷	حسین اور اسلام (اردو)	۱ر	۲ر	۲۶	مذہب باب بہا حصہ دوم	۹ر	۱ر
۸	” ” (ہندی)	۱ر	۳ر	۲۷	مذہب اور سائنس	۱ر	۳ر
۹	” ” (انگریزی)	ختم		۲۸	معرکۂ کربلا	ختم	
۱۰	متعہ اور اسلام	۹ر	۲ر	۲۹	کربلا کا مہایدھ	”	
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	ر	۳ر	۳۰	دی ٹریجیڈی آف کربلا (انگریزی)	۲ر	۳ر
۱۲	تجارت اور اسلام (ختم)	۳ر	۱ر	۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	۹ر	۱ر
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم (ختم)	۴ر	۱ر	۳۲	دور استبداد	۴ر	۱ر
۱۴	علی اور کعبہ (ختم)	۱ر	۳ر	۳۳	حقیقت بداء	۲ر	۳ر
۱۵	رجال بخاری حصہ اول	۶ر	۱ر	۳۴	خطیب آل محمد	۴ر	۱ر
۱۶	مذہب باب بہا حصہ اول	۵ر	۱ر	۳۵	تدوین حدیث	۱ر	۳ر
۱۷	نور جوہ و غدیر	۱ر	۳ر	۳۶	مطلوب کعبہ	۱ر	۳ر
۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲ر	۳ر	۳۷	محاربۂ کربلا	۲ر	۳ر
۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی)	ختم		۳۸	اسلام کا پیغام اردو	ر	۳ر

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۳۹	دی سپیچ آف اسلام انگریزی	۱۰/	۳/	۴۸	شہدائے کربلا	۷/	۱/
۴۰	اثبات عزاداری	۴/	۱/	۴۹	کربلا کا مہاسمر (ہندی)	۲/	۳/
۴۱	مسئلہ فدک	۵/	۱/	۵۰	حسین اِن دی لیمپ آف کربلا	۱/	۳/
۴۲	تاجدار کعبہ	۱/	۳/	۵۱	مشہد اعظم	۱/	۳/
۴۳	خلافت و امامت حصہ اول	۵/	۱/	۵۲	لا تفسدوا فی الارض	۸/	۱/
۴۴	" " حصہ دوم	۴/	۱/	۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۴/	۱/
۴۵	" " حصہ سوم	۴/	۱/	۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	زیر طبع	
۴۶	تحقیق اذان	۱/	۳/	۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	"	
۴۷	ذوالجناح	۱/	۳/	۵۶	ابو الائمہ کی تعلیمات	"	

فہرست کتب امامیہ مشن بک ایجنسی

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۱	حسین دی مارٹر (انگریزی) ختم	۱۲/	۳/	۸	رسالہ رسول کی بیٹی	۲/	۳/
۲	الشہید	۱۰/	۱/	۹	گل عصمت	۱/	۳/
۳	کائنات قبل از اسلام	۲/	۳/	۱۰	رجال بخاری حصہ دوم	۶/	۱/
۴	قاتلان حسین کی گرفتاری	۸/	۲/	۱۱	ڈیرم نزم اینڈ فری آف ملفوظ (انگریزی)	۱۲/	[illegible]
۵	جمع دینیات	[illegible]	۲/	۱۲	تاریخ اندواج	۸/	[illegible]
۶	ذخیرۃ الاحکام	۴/	۱/	۱۳	الہامی کلمات	۳/	۱/
۷	صحیفہ بو تجلی (رباعی)	۸/	۱/	۱۴	شہید اسلام	۶/	۵/

پرنٹر ممتاز حسین جونپوری، پبلشر سید محمد رضا نقوی۔